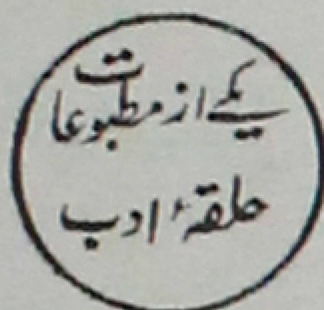
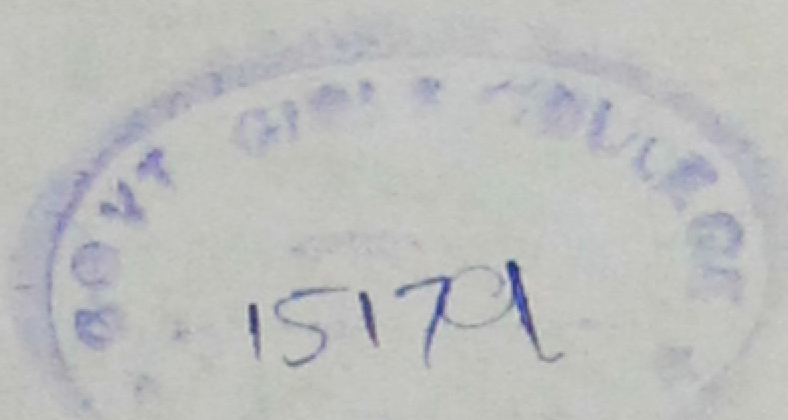
قہقہہ زار

خواجہ عبدالغفور

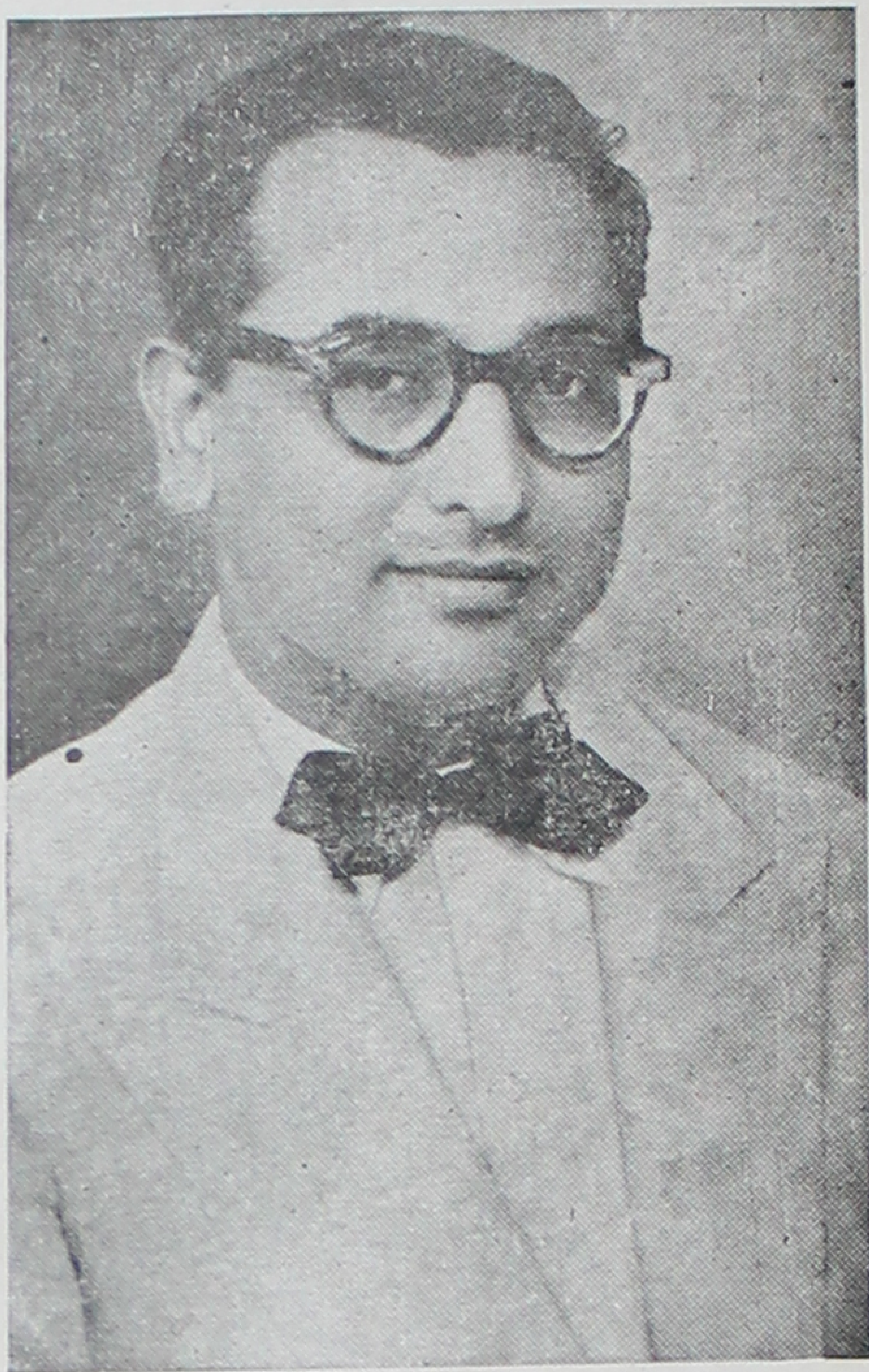
بار اوّل

تعداد اشاعت ۱۵۰۰
کتابت ظفر مہدی
طباعت یونیورسل لیتھو پریس ۲۳۔ نوروجی اسٹریٹ بمبئی ۲
قیمت چار روپے





طابع و ناشر شہریار عابدی نے یونیورسل پریس میں طبع کروا کر حلقۂ ادب کے لیے
۲۴۳ مولانا آزاد روڈ سے شائع کیا۔



K. A. GHAFOOR
I. A. S.

انتساب

"اُن کے نام کہ جنہیں میں ہمیشہ ہنستا ہوا دیکھنا چاہتا ہوں"

یہ کتاب ان کے نام نہیں ہے جنہیں ہنسنے سے تکلیف ہوتی ہے۔ اور اُن کے نام کی ہے جو بلاوجہ ہنستے رہتے ہیں۔
یہ کتاب ان کے نام ہے جو دوسروں کی ہنسی میں ہنسی خوشی شریک ہوتے ہیں اور ہنسی کو پیشہ نہیں تہذیب سمجھتے ہیں اور جو ستم ظریف ہیں۔ لطائف الحیل سے بخوبی واقف ہیں۔ اپنی کمزوریوں پر ہنسنا جانتے ہیں اور دوسروں کی کمزوریوں کو ہنس کر ٹالنے کا گر جانتے ہیں اُن کے لئے اس میں شاید ہی کوئی نئی بات ملے گی۔

اِلتجا

عرض ہے کہ جن حضرات کو تصنیف، تالیف، تحریف، تخریف بلکہ تغلب اور تصرف کی عادت ہے وہ بلا تکلف بغیر حیلہ و حوالہ، بنا معذرت اور بے جھجک ان لطیفوں کو اپنائیں آزمائیں اور لطیفہ گوئی کو اپنا شعار بنائیں لطیفہ سازی۔ لطیفہ نوازی۔ لطیفہ دوستی اور لطیفہ گری کریں تا کہ اُس زندگی کے چند لمحے مسکراہٹ اور قہقہوں میں بدل جائیں۔

مکرر

کہاوت ہے کہ ہنسنے کے ساتھ ساتھ رونا بھی ہے اسلئے اسکا احتمال بھی ہے کہ کہیں جشنِ مزاح اور شامِ قہقہہ کے جواب میں آنسو بہانے اور آہیں بھرنے والے مالیخولیا کے مریض، آہ و بکا کی ہولناک محفل نہ منعقد کر بیٹھیں اور اس میں ایسے ایسے نکات پیدا کریں کہ آنسو نہ تھمیں اتنے آنسو بہائے جائیں کہ سارا ہال جل تھل ہو جائے گریہ وزاری کے ساتھ ساتھ دل آزاری اور دل گیری کا سامان فراہم کریں مزاح کے بجائے حزن اور ساز کی جگہ سوز استعمال کیا جائے۔

دردناک تجاویز پیش ہوں اور جلسہ کی کارروائی اتنی رقت انگیز ہو کہ جو بھی بولنے کھڑا ہو اس کے منہ سے ایک لفظ نہ نکلے اور صرف ہچکیاں لے لے کر روتا رہے۔ غم خوار غم گسار غم ڈھانے والے مرغ بسمل، خستۂ تیغ ستم، مصورِ غم المیہ اور حزنیہ لکھنے والے تو ضرور شریک رہیں گے لیکن اس شاعر کو بھی اس میں ضرور مدعو کیا جائے جس نے کہا ہے ؎

رونے پہ جو آئیں تو دریا ہی بہا دیں
شبنم کی طرح سے ہمیں رونا نہیں آتا

تعارف

عبدالغفور صاحب مجموعہ اضداد ہیں۔ بڑے حاکم ہیں۔ یعنی انڈین ایڈمنسٹریٹو سروس کے رکن۔ حکومت کے اعلیٰ ترین منتظمین میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ لیکن اپنے دوسرے احباب کی طرح یہ محض ایک سرکاری منتظم ہو کر نہیں رہ گئے ہیں۔ یہ صاحب علم و فن بھی ہیں۔ SOCIAL اور APPLIED ANTHROPOLOGY ان کے محبوب موضوعات رہے ہیں۔ اور انگریزوں کے زمانے سے ان کا شمار اس موضوع کے گنے چنے ماہرین میں ہوتا ہے۔ اس موضوع پر ان کی کتابیں یونائیٹڈ نیشنس تک نے چھاپی ہیں۔ اس اعتبار سے یہ ایک مصنف بھی ہیں اور بین الاقوامی شہرت کے مالک۔ اس پر مستزاد یہ کہ لطیفے بھی کہتے ہیں۔

APPLIED ANTHROPOLOGY جیسے بظاہر خشک اور سائینسی موضوع پر ہمہ گیر دسترس رکھنے والا لطیفے بھی کہے بجائے خود ایک

لطیفہ ہے۔ اسی لئے تو جب آپ نے اپنا مجموعہ مجھے مطالعے کے لئے دیا تو مجھے ایک گونہ حیرت ہوئی۔ پھر میں نے اپنے دل کو یہ کہہ کر سمجھا لیا کہ لطیفہ گوئی بھی بالآخر ایک طرح کی APPLIED ANTHROLOGY ہی ہے۔

جناب عبدالغفور صاحب باغ و بہار آدمی ہیں۔ لطیفہ گوئی کو انہوں نے اس کتاب کے ذریعہ ایک مستقل فن کی حیثیت دی ہے۔ اپنے چند دوستوں کی اعانت سے اُنہوں نے ممبئی میں لطیفہ گو حضرات کی ایک انجمن بھی ترتیب دی ہے۔ اکثر نجی محفلوں میں یہ لوگ اکٹھے ہوتے ہیں۔ اور ایک دوسرے کی فراست طبع کا امتحان لینے کیلئے لطیفہ آزمائی کیا کرتے ہیں۔ دو یا تین برس پہلے ممبئی کے خوش ذوق نوجوانوں کی ایک انجمن نے کہ جو بوبیا کے نام سے پکاری جاتی ہے باقاعدہ ایک پبلک ہال میں ایک محفل منعقد کی تھی۔ جس میں چیدہ چیدہ لطیفہ گو حضرات نے عمدہ سے عمدہ لطیفے پیش کیے تھے اور اب یہ سلسلہ چل نکلا ہے۔

گزشتہ سال حیدرآباد میں لطیفہ ڈے منایا گیا جسکے روحِ رواں مجتبیٰ حسین تھے اور اس سال جناب عبدالغفور صاحب ممبئی میں پھر لطیفہ گویانِ ہند کا ایک ہنگامہ برپا کرنے کا تہیہ کیے بیٹھے ہیں۔ لیجئے بیٹھے بٹھائے لطیفہ گوئی کا ہلکا پھلکا مشغلہ ایک

ادبی فن کی حیثیت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ اور اگر اس کی ترقی کی یہی رفتار رہی اور اس کی مقبولیت کا یہی عالم رہا تو کوئی عجب نہیں کہ ایک دن حکومت بھی اس کی فنی حیثیت تسلیم کرلے اور اس ملک میں ساہتیہ اکاڈیمی اور سنگیت اکاڈیمی کی طرح لطیفہ اکاڈیمی کا قیام بھی عمل میں آئے۔ اور اگر کبھی یا کسی دن یوں ہوا تو کیا عجب کہ ہمارے مہربان عبدالغفور صاحب ہی اس اکاڈیمی کے صدر یا سکریٹری مقرر کر دیئے جائیں۔

تازہ ترین خبر یہ ہے کہ عبدالغفور صاحب نے فنِ لطیفہ گوئی پر ایک کتاب تصنیف کر پائی ہے۔ جو اس وقت آپ کے ہات میں ہے جس میں انہوں نے سینکڑوں بہتر سے بہترین اور نادر سے نادر ترین لطیفے یکجا کرنے کے علاوہ اس مشکل ترین فن کا علمی اور نفسیاتی جائزہ بھی لیا ہے۔ اردو میں اس موضوع پر یہ پہلی کتاب ہے اور عبدالعفور صاحب کے متعلق مشہور ہے کہ پہل کرنے سے کبھی نہیں چوکتے۔ APPLIED ہو یا لطیفہ سازی ANTHROLOGY۔

میں آپ کو یہ بتانا تو بھول ہی گیا کہ عبدالغفور صاحب ہندوستانی کلاسیکل موسیقی کے بھی رسیا ہیں۔ اور بمبئی میں جب بھی بڑی سے بڑی سنگیت محفلیں منعقد ہوتی ہیں

اُن کی سرپرستی یہ ضرور فرماتے ہیں۔ سنگیت سے لطیفے تک ذہنی دھنک کا جو سلسلہ پیدا ہوتا ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ عبدالغفور صاحب نے ایک سائنٹیفک دماغ پایا ہے جو شعوری طور پر سنگیت اور لطیفے میں بھی مماثلت ڈھونڈ لیتا ہے۔ بہرحال یہ تو ظاہر ہے کہ سنگیت کی بہت سی صفات لطیفے میں پائی جاتی ہیں ہر لطیفے کا ایک اندرونی ردم ہوتا ہے۔ اس میں ایک سُر بھی زائد نہیں لگایا جاتا ہے۔ ہر لطیفہ سم پر ختم ہوتا ہے۔ اس طرح سے گویا جو لطیفہ ہے وہ ہماری حسِ مزاح کا سنگیت ہے۔

عبدالغفور صاحب نے یہ کتاب بے حد دلچسپ، دلنشیں اور دلکش پیرائے میں لکھی ہے۔ سینکڑوں عمدہ لطیفے مختلف عنوان کے زیرِ تحت جمع کئے ہیں اور یوں گویا لطیفوں کے جنگل میں گھس کر چمن بندی اور صف آرائی کی کوشش کی ہے۔ جو بہر صورت کامیاب ہے۔ ممکن ہے لطیفوں کے اس نادر مجموعے میں آپکو دو چار لطیفے ایسے بھی ملیں جو پہلے بھی آپ کی نظر سے گزرے ہوں مگر کوئی مضائقہ نہیں۔ ایک حسین عورت کی طرح ایک حسین لطیفے سے دوبارہ ملاقات کرنے میں کوئی حرج نہیں بلکہ جی خوش ہوتا ہے۔ روح کو بالیدگی عطا ہوتی ہے۔ اور آنکھوں میں طراوت آتی ہے۔

اُمید ہے قارئین کرام اس مجموعے کو اس درجہ پسند فرمائیں گے کہ عبدالغفور صاحب سے اس ضمن میں مزید مجموعوں کی فرمائش کی جا سکے۔ کیونکہ لطیفہ گوئی ایک بحرِ ذخار ہے جس کی شناوری کرتے کرتے اس وقت چند گوہرِ آبدار ہی آپ کی خدمت میں پیش کئے جا سکے ہیں۔ بہت سے عنوانات رہ گئے ہیں جن پر آئندہ طبع آزمائی ہو سکتی ہے۔ جنسی لطیفوں کا موضوع اس قدر تشنہ رہ گیا ہے کہ جب میں نے عبدالغفور صاحب کی توجہ اس طرف دلائی تو مسکرا کر بولے "تعزیراتِ ہند مانع ہے۔ ورنہ میرے پاس تو ایک ذخیرہ ہے جس سے صرف اسی موضوع سے متعلق ایک کتاب مرتب ہو سکتی ہے۔ اس لئے اس باب میں صرف ایسے ڈھکے چھپے۔ شریف منکسر المزاج۔ نیک لطیفے جمع کر گئے ہیں جنہیں مستند اور ثقہ حضرات بھی گوارا کر سکیں۔"

ممکن ہے اسکی وجہ یہ بھی ہو کہ کئی سو سال سے ہندوستان نے ہنسنا چھوڑ رکھا تھا۔ آج بھی ساری مہذب سوسائٹی میں کھل کے ہنسنا ایک فعلِ قبیح مانا جاتا ہے۔ مگر اب برف پگھل رہی ہے۔ دھیرے دھیرے لوگ ہنسنے کی ضرورت محسوس کر رہے ہیں۔ چاہے اپنے آپ پر ہنسیں یا حالات پر یا دونوں پر۔ فنِ مزاح پر لطیفہ جس کی ایک اہم صنف ہے سنجیدہ

اور علمی کام ہو رہا ہے۔ زیرِ نظر کتاب لطیفہ گوئی کے فن پر ایک کامیاب کاوش کا درجہ رکھتی ہے، جسے عبدالغفور صاحب کی جدت طراز طبیعت نے اپنے فکر و فن کی معنی آفرینی، اسلوب کی رنگینی اور موضوع کی بوقلمونی سے سبدِ گل کی صورت عطا کی ہے۔

کرشن چندر

اشاریہ

صفحات نمبر

۱۷ فنِ لطیفہ
۱۹ مذاق
۲۰ ٹھٹھول اور تخول
۲۱ لطیفہ کا معیار
۲۳ چٹکلہ
۲۴ لطیفہ گوئی کا آسرا
۲۶ مزاح
۲۷ لطیفہ گوئی
۳۵ بچوں کے منہ سے
۳۹ شخصیتوں کا سہارا
۴۴ لطیفہ گری
۴۷ غائب دماغ پروفیسر
۵۰ حاضر دماغ پروفیسر
۵۲ حاضر جوابی
۵۵ برجستہ گوئی
۵۹ نوکروں سے دماغ پاشی
۶۴ خوش فہمی
۶۶ مشینی مزاح و طنز
۶۸ ترکی کے ملا نصیر الدین
۷۱ زبان کے کرشمے
۷۴ جامعہ عثمانیہ میں مزاح
۸۱ عدالت کے کمروں سے
۸۳ مزدور تحریک
۸۴ مزاح کی اولین چاشنی
۸۶ مبالغہ

صفحات نمبر

۸۹ اشتہار بازی
۹۲ شاہی دربار کی چشمک
۹۵ زن مریدی
۱۰۱ تقریر
۱۰۴ سستی اور کاہلی
۱۰۸ جنسی تعلیم
۱۱۲ ڈاکٹر و معالج
۱۱۷ فاتر العقل
۱۲۱ توڑ مروڑ
۱۲۳ سرکاری دفاتر سے
۱۲۹ پارکنسن کا قانون
۱۳۳ بزرگوں کی باتیں
۱۳۹ سیاسی میدان سے
۱۴۷ عُریاں مگر
۱۶۲ پیرانہ سالی
۱۶۶ تمباکو نوشی
۱۶۸ دوستی دوستی میں
۱۷۳ عروس البلاد بمبئی
۱۷۵ خوش دامن
۱۷۸ محاورے
۱۸۳ مشاعرہ
۱۸۴ آئی ایس جوہر
۱۸۶ آغا جانی کاشمیری
۱۸۷ سائنس اور صنعت
۱۹۲ بعد از مرگ

شکریہ

بات کچھ اس طرح ہے کہ لطائف وظرائف کا بے حساب ذخیرہ دماغ میں برسوں سے جمع ہوتا رہا ہے لطیفہ گوئی کی محفلوں میں بھی شریک رہا لیکن خود سے لطیفے کہنے اور سنانے کے معاملے میں کچھ تکلف رہا کیا بہت ہی زیادہ برموقع بات ہوئی تو ضرور سنا بیٹھا ورنہ سننے کو ہمیشہ دہرانے پر ترجیح دی۔ کچھ دن پہلے سوچا کہ ان کو کسی ترتیب کے ساتھ اکٹھا کرنا چاہیے تو کچھ عنوانات قائم کر کے خوش مذاق، عام فہم اور اپنے ماحول سے میل کھانے والے لطیفوں کو قلم بند کرتا رہا۔ ان کی طباعت واشاعت حاشیہ خیال میں بھی نہ تھی۔ کچھ احباب کو پتہ چلا تو انھوں نے اس بات پر اصرار کیا کہ ان کو ضرور چھپوانا چاہیے اس بات پر سب سے زیادہ یوسف ناظم مصر رہے بلکہ اس خصوص میں ہر قسم کی امداد کا نہ صرف وعدہ کیا بلکہ عملی تعاون بھی پیش کر دیا۔
مکتبہ جامعہ کے شاہد اور صبح امید کے عبدالحمید لوہیرے بھی ہمت

بند ہاتے رہے مجتبیٰ حسین نے بھی اصرار کیا۔ شہریار عابدی نے تو پورا پلان اپنے ہاتھ میں لے لیا اور میری ادبی کاوش کو اپنی صحافت کا سہارا دیتے ہوئے کتابت طباعت اور اشاعت کی مکمل ذمہ داری قبول کر لی یہ کہنہ مشق اور دیرینہ تجربہ رکھنے والے صحافی ہیں لیکن اس میدان میں اُن کا یہ پہلا قدم ہے جو قہقہہ سے شروع ہو رہا ہے۔ خدا کرے کہ یہ انہیں راس آئے۔ ان کے ساتھ نوجوان خوش قلم کاتب ظفر ہیں جن کی پُرفن کتابت سے کتاب دیدہ زیب اور غلطیوں سے پاک و صاف ہے۔

میری یہ کاوش خود میرے لئے اتنی زیادہ تشفی بخش نہ ہوتی اگر اس میں کرشن چندر کو از خود غیر معمولی دلچسپی لیتے ہوئے نہ دیکھتا۔ ناسازیٔ مزاج اور لکھنے پڑھنے کی ممانعت کے باوجود انہوں نے جس انہماک اور دلچسپی سے مسودہ کو بار بار دیکھا اور اپنے گرانقدر مشوروں سے لیے نوازا اسکے اظہار کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں اور نہ میں ان کا شکریہ ادا کرنے کی ضرورت محسوس کرتا ہوں کیونکہ جو کچھ انہوں نے کیا اُس کے پسِ پشت ان کا وہ خلوص ہے جو نایاب ہے اور خلوص کبھی شکریہ جیسی رسمی بات کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ نہ صرف اُنہوں نے بلکہ سلمیٰ صدیقی نے بھی لطیفے کہنے اور سُننے کی مختصر نشستوں میں جولانیٔ طبع شستہ مذاق اور ادبی ذوق کے ایسے جوہر دکھائے کہ

اس مجموعہ کو آب و تاب ملی اور یہ ہر لحاظ سے مکمل بنکر آپ کے سامنے پیش ہے۔ اس کتاب نے جو خلوص و محبت کا رشتہ قائم کیا ہے وہ ہمیشہ لطف و یگانگت کا سرچشمہ رہے گا۔

آدمی فطرتاً کتنا ہی بذلہ سنج ظریف اور زندہ دل ہو عملی زندگی میں قدم رکھنے کے بعد روکھا پھیکا ہو جاتا ہے، اور اکثر تو متانت و سنجیدگی کو اس قدر اپنا لیتا ہے کہ ہنسنے کو بے ادبی اور قہقہہ کو اخلاقی جرم سمجھ بیٹھتا ہے۔ میرے حسِ ظرافت SENSE OF HUMOR کو اور ہنسنے ہنسانے کے فطری رجحان کو برقرار رکھنے میں کسی کا دخل ہے تو میری شریکِ حیات کا ہے جو زندگی کی جد و جہد میں ہمیشہ میری مددگار اور ہم جلیس رہیں اور وقتاً فوقتاً داد و تحسین سے حوصلہ افزائی بھی کرتی رہیں۔ حبیبہ کے فنِ موسیقی کے فطری شوق اور قدرتی دسترس اور مہارت نے انہیں فنونِ لطیفہ کے دیگر شعبوں سے بھی نزدیک رکھا۔ ان کا زندگی کے ہر موڑ پر خندہ زنی کا جذبہ میری اس کاوش کو انجام تک پہنچانے میں دخیل رہا ہے اور میں اس کا ذکر اسلئے نہیں کرنا چاہتا کہ یہ گھر کی بات ہے، اس خدشہ کا البتہ میں ذکر کر دوں کہ اگر ظرافت سے حبیبہ کی دلچسپی یوں ہی رہی تو میں اسی رنگ کی کوئی اور چیز آپ کی خدمت میں پیش کر بیٹھوں گا۔

اس کتاب میں اگر کچھ خوبیاں نکھر گئی ہیں تو وہ میرے اس

مطالعہ کا نچوڑ ہیں کہ جو مجھے اوائل عمر میں اودھ پنچ، چلم گزٹ اور اردو کے بے شمار رسالوں میں مدت دراز ہوئے ملا تھا۔ لیکن پنچ، ڈیلی مرر، نیویارکر وغیرہ کے مطالعہ کے سوا دنیا کے مختلف ممالک کی سیاحت کے دوران مشرقی و مغربی مزاح کو خلط ملط کر کے اردو زبان میں ایک نئی چیز پیش کرنے کا حوصلہ ملا اسکے لئے یونائیٹڈ نیشن کا ممنون ہوں۔

مجھے یقین ہے کہ اس مجموعہ میں جو لطیفے شامل ہیں ان سے کسی کی دل شکنی ہو گی اور نہ وہ کسی کے مزاج پر گراں گزریں گے پھر بھی کسی بات سے اشارتاً یا کنایتاً ایسا ہو جائے تو اس کے لئے قبل از قبل معذرت خواہ ہوں۔

میرا شکریہ نامکمل رہے گا اگر سنگار سمسد کے کے ناظم اعلیٰ برج نارائن کا ذکر نہ کروں کہ جنہوں نے امسال شرنگار سمیلن کے موقعہ پر جشن قہقہہ منعقد کرنے کی تجویز نکالی اور میں نے اس کو ایک چیالنج سمجھ کر اسی سلسلہ میں یہ ہدیۂ لطیف پیش کر رہا ہوں۔

ع گر قبول افتد زہے نصیب

فنِ لطیفہ

کہتے ہیں کہ رونا اور گانا کسکو نہیں آتا۔ نہ معلوم اس کے پیچھے کس کا اور کیا تجربہ ہے مگر ہم نے ایسے لوگ شاذ ہی دیکھے ہیں اور پھر ہنسنے کو کیوں خارج از بحث کردیا گیا ہے یہ بات بالکل سمجھ میں نہیں آتی۔ اصولاً ہنسنے اور رونے پر کوئی محاورہ ہونا چاہئیے تھا مگر شاید یہ بات مشاہدہ میں آئی ہے کہ بہت سارے لوگ خود سے ہنس نہیں سکتے ان کو مختلف طریقوں سے ہنسنے پر مجبور کرنا پڑتا ہے اسی لئے لطیفوں کی ایجاد و اختراع ہوئی ہے اور جب سے یہ وجود میں آئے ہیں سکۂ رائج الوقت کی طرح استعمال ہوتے ہیں۔ ان کو چرایا بھی جا سکتا ہے مگر بطور قرض دیئے جا سکتے ہیں نہ لئے جا سکتے ہیں۔ بس ہمیشہ چلن میں رہتے ہیں حتیٰ کہ کھوٹے سکے کی طرح غلط سلط لطیفے بھی لوٹا رے

جانے کے باوجود گردش میں ہی رہتے ہیں۔

البتہ بہت زیادہ چلن سے یہ گھس پس ضرور جاتے ہیں اور کبھی کبھی تو اِن میں تعفن بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ ایسی دولت ہیں کہ جو کالے بازار میں نہیں ملتی اور جسکو کالے روپے کی طرح غسل خانے کی چھت پر یا ملاقات کے کمرے کے قالین کے نیچے چھپایا نہیں جا سکتا۔

لطیفہ گوئی فنونِ لطیفہ میں شامل نہیں اور اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ اس کا نام ہی خود لطیفہ ہے اور اس کے لئے کوئی بہت بڑی فنکاری کی ضرورت نہیں۔ لطافت اور نزاکتِ خیال شگفتگیٔ بیان۔ حسنِ نگارش۔ تفریحِ طبع۔ لذتیت اور شوخی کے اِس مجموعے کو فنونِ لطیفہ میں سب سے زیادہ اہم اور نمایاں درجہ ضرور ملنا چاہئیے۔

لطیفہ گوئی جتنا آسان فن ہے اتنا ہی مشکل بھی ہے۔ لطیفہ کا مختصر سے مختصر ہونا ضروری ہے۔ اور اسی لیئے تمہید اور کسی پس منظر کے بغیر مطلب کی بات کو اس طرح ادا کرنا ضروری ہوتا ہے کہ ایک ہلکی سی گدگدی پیدا ہو جو انجانے طور پر دھیرے دھیرے جسم وجان میں سرایت کر جائے ہونٹوں پر مسکراہٹ سنور جائے اور ایسے محسوس

ہو کہ کچھ یہی بات ہمارے دل میں بھی تھی اور شاید مُناسب وقت پر ہم خود بھی کہہ ڈالتے۔

دلچسپ بات تو یہ ہے کہ انگریزی جیسی جامع زبان میں ایسا کوئی لفظ نہیں جو اس حُسنِ اسلوب نزاکت اور خیال کی رعنائیوں کو ادا کر سکے جو لطیفہ گوئی یا لطیفہ کی خصوصیات ہیں ہیومر بے شک ظرافت ہے لیکن "جوک" اسقدر ذو معنی لفظ ہے کہ وہ سب کچھ تو ظاہر کرتا ہے لیکن لطیفے کے معنی نہیں دیتا۔ ہیومرسٹ ظریف کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے لیکن "جوکر" کوئی اور ہی شخص ہوتا ہے اور بیشتر وہ مسخرہ بن جاتا ہے۔ لفظ "جوک" اس سطح مرتفع پر نہیں پہونچتا کہ جہاں لطیفہ جنم لیتا ہے۔ اس سے نچلی سطح کے نداق کا تصوّر پیدا ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ لطیفے اور نداق میں دور کا بھی رشتہ نہیں نداق ذوق و شوق کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ کسی کا نداق اچھا بھی ہو سکتا ہے برا بھی۔ یہ نداق TASTE ہوا جوک نہیں۔ نداق کیا بھی جاتا ہے نداق اڑایا بھی جاتا ہے۔ کئی باتیں نداق نداق میں ہو جاتی ہیں۔ کوئی شخص نداقی ہو سکتا ہے اور کوئی بات نداقیہ۔ ان سب کے لئے ایک ہلکا پھلکا لفظ ڈِگی ہے۔ مگر اس میں سوقیانہ پن ہے۔

مذاق تو کسی دوسرے کے نقص یا اس کی کمزوری اور برائی کو اچھال کر کیا جا سکتا ہے کسی کو انجانے میں بے وقوف بنا کر کسی پر طنز کر کے کسی کے تمسخر سے یا کسی اور کی بات کو کسی خاص شخص پر منطبق کر کے بھی سننے والوں کے لئے ہنسی کا سامان پیدا کیا جا سکتا ہے۔

مذاق سے بھی گرا ہوا درجہ ٹھٹھول۔ ٹھٹھے کا اور "مخول" کا ہے۔ البتہ تفنن کا درجہ بین بین ہے۔ اس فن کے ماہر میراثی یا میر اندار ہوا کرتے تھے یا پیشہ ور حضرات کہ جنکو اسی کام کے لئے مامور کیا جاتا تھا۔ لطیفہ گوئی کا فن ان سب سے اونچا ہے لطیفوں سے صرف ایک ہنسی یا قہقہہ کی دیوار کھڑا کر دینا، مقصود نہیں کہ جو چند ہی لمحوں میں زمین پر آ رہے۔ بلکہ اس کا مقصد تو تہے لطیف کو چھونا اور اس طرح چھونا کہ رواں، رواں جھوم اٹھے۔ اور یہ محسوس ہو کہ مقویات کا انجکشن دیدیا گیا ہے۔ جو جسم کے رگ وریشہ میں سرایت کر کے تازگی وفرحت بخشتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ بروماینڈ کی آسودگی اور ایک قسم کا سرور بھی۔ لطیفے سے وہ کیفیت پیدا ہونی چاہئے کہ جو سخت گرمی کے موسم میں پیاس کے عالم میں خشک ہونٹوں سے حلق میں اترتا ہوا ٹھنڈا پانی پیدا کرتا ہے۔

مذاق کی کیفیات میں موقتی تاثرات تھوڑی دیر کے لئے خوشگوار ثابت ہو سکتے ہیں لیکن بات ختم ہوتے ہوتے کسک سی محسوس ہونے لگتی ہے۔ جیسے شکر میں لپٹی ہوئی دوا کی گولی کھائی گئی ہو اور شکر گھل جانے پر دوا کی کڑواہٹ کا مزا آنے لگے۔

لطیفے کے معیار کا انحصار اس پر ہے کہ زیرِ لب تبسّم کے بعد ہنسی کی کونسی کیفیات پیدا ہوتی ہیں۔ کیا لطیفہ کا معمول (وہ شخص جس پر عمل کیا گیا ہو) ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہو جاتا ہے۔ پیٹ پکڑ کر ہنستا ہے۔ اسکے پیٹ میں بل پڑ جاتے ہیں۔ ہنستے ہنستے آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے ہیں یا وہ ہنسی کا گول گپا بن جاتا ہے؟ دراصل یہ سب کیفیات لطافت اور نزاکت سے معرا ہیں۔ ہنسی تو فی الواقعی ایسی ہو کہ جیسے نقرئی گھنٹیاں دھیمے دھیمے بج رہی ہوں۔ اور انبساط پھوٹ پڑے۔ ان سے مختلف اور کثیف کیفیات قہقہوں کی ہوتی ہیں۔

فلک شگاف قہقہے۔ کھوکھلے۔ بے سُرے بے ہنگم بے ساختہ بلکہ بے تحاشا اور بے ڈھنگے قہقہے۔ اِن سے آگے کی منزل تو اور بھی تکلیف دہ ہوتی ہے۔ جہاں مکروہ اور کھانسی بھرے قہقہوں کی آوازیں ہوتی ہیں۔ یہ خوشی کا

ہنستا نہ ہوا ڈھول پٹتا ہوا۔

لطیفوں کا ردِّ عمل تو سیدھی سادھی ہنسی ہے۔ ان کا اثر تو یہ ہونا چاہیے کہ زیادہ سے زیادہ آکسیجن پیٹ میں جائے اور پھیپھڑوں کے ذریعہ شریانوں اور رگوں میں دوڑ جائے۔ دل و دماغ کو ایسی فرحت ہو جو عمر میں چند لمحوں کے اضافے کا باعث بنے۔

لطیفہ کا اثر وہ نہیں ہونا چاہئے جو پٹاخے کے پھٹنے کا ہوتا ہے بلکہ وہ ہونا چاہیئے جو پھلجھڑی کے چھوٹنے کا ہوتا ہے لطیفے بم کی طرح دھماکے نہیں ہوتے بلکہ نسیم سحری کے اس جھونکے کی طرح ہوتے ہیں جس کے لمس سے کلیاں چٹک جاتی ہیں غنچے کھل اٹھتے ہیں اور باغوں میں بہاریں آجاتی ہیں۔

لطیفہ گوئی کے لئے لطافت بیان اور نزاکت خیال کا وہ امتزاج ضروری ہے جو عمدہ شعر کے موزوں کرنے کیلئے درکار ہوتا ہے۔ ایک عمدہ لطیفہ ایک مرصع غزل کی طرح مکمل ہوتا ہے۔ پست درجے کے لطیفے کو عریانی کا سہارا دینا یا لطیفے کے پھسپھسے پن کو چھپانے کیلئے گالی۔ فحش کلامی یا گندگی کا آسرا لینا یا برہنگی کے جذبہ کی نمائش۔ لطیفے کے مزاج کو نہیں بدلتے۔ یہ تو ایسا

ہی ہوا جیسے پھیکے اور بدمزہ کھانے کو چٹنی اور اچار کی مدد سے چٹخارہ دار بنا دیا جائے اور آدمی ضرورت سے بھی زیادہ کھالے لیکن اس سے کھانے کو تو لذیز نہیں کہا جا سکتا اور نہ ہی اسکی تعریف کی جا سکتی ہے۔ اسی طرح کسی غیر دلچسپ اور معمولی قصّے میں اخلاق سے گری ہوئی باتیں شامل کر کے سننے والے کو ہنسنے پر مجبور کر دیا جائے تو یہ مزاح ہوا نہ ظرافت یہ تو مار پیٹ کر ہنسنے پر مجبور کیئے جانے کی بات ہوئی۔

لطیفے سے کچھ دبتا ہوا درجہ ہے چٹکلے کا۔ اس میں کسی ایک چھوٹے سے نکتے پر ہنسا کر بات کو ختم کر دیا جاتا ہے۔ اس کا اثر دیرپا نہیں ہوتا اور نہ ہنسنے والا یہ محسوس کرتا ہے کہ یہ بات دہرائی جانے کے لایق ہے۔ دسترخوان پر مرغ بیشں ہوا تو مہمان نے کہا "مجھے تو مرغ کی بائیں ٹانگ پسند ہے وہ کھلائیے تو حقِ میزبانی ادا ہوگا" کچھ دیر کے لیئے میزبان پریشان ہو گیا اور پھر بات ہنسی اور قہقہوں میں گم ہو گئی۔ یہ چٹکلہ ہوا۔ مرغ کی ایک ہی ٹانگ والی کہانی بھی چٹکلہ ہی ہے۔

ایک صاحب ذکر کر رہے تھے کہ فلاں وقت مچھلی نے ان کی جان بچائی۔ لوگ متوجہ ہوئے کہ شاید کوئی انوکھی بات سننے میں آئے گی۔ لیکن کہا گیا کہ یہ بہت بھوکے تھے اور بھوک کے مارے

ان کی جان نکلی جارہی تھی ایسے میں انہیں مچھلی مل گئی جسے کھا کر ان کی جان بچ گئی۔ یہ بھی چٹکلا ہوا۔

لطیفوں کی اساس مشاہدہ اور تاثر یا تجربہ و حادثہ ہوا کرتے ہیں اور ان کو مختصر سے مختصر لفظوں میں دل آویز طریقہ پر پیش کرنا اور قطرہ کو دجلہ کی وسعت دینا ہی ایک فنِ لطیف ہے لیکن خوش گپی ایک بالکل علیحدہ چیز ہے جس میں بلا موضوع بلکہ بسا اوقات بلا وجہ ہی کوئی گپ بازی کا سلسلہ شروع کر دیتا ہے مگر دوسروں کو نقصان پہونچائے بغیر صرف وقت گذاری کیلئے یا کسی سرور کے تحت۔

ایسا بھی ہوتا ہے کہ لطیفوں کو مقبولِ عام کرنے کیلئے خاص خاص شخصیتوں کا سہارا لیا جاتا ہے چاہے وہ حقیقی ہوں کہ محض فرضی۔ لیکن جب کبھی ان کا نام چل پڑتا ہے تو درجنوں لطیفے انہیں کے نام سے منسوب کر دئیے جاتے ہیں۔ تاکہ اُن میں چاشنی پڑ جائے۔ ایسے کئی قصے ملّا دو پیازہ اور بیربل کے نام سے مشہور ہیں۔ لیکن اِن قصوں اور لطیفوں کو کوئی ادبی حیثیت یا مرتبہ حاصل نہ ہو سکا۔ اسی طرح حیدرآباد کے جمال الدین صاحب کے نام سے جو بھی لطیفہ منسوب ہو جاتا اس میں جان پڑ جاتی۔ ترکی کے ملّا نصیر الدین کے نام میں تو جادو

ہے اور ان کے قصے بھی انہیں زندہ جاوید بنائے ہوئے ہیں۔

لطیفوں کا سامان بچوں کی معصومیت کے قصوں میں بھی ملتا ہے۔ اور پاگل خانوں کے ان مکینوں کی باتوں میں بھی جنہیں دنیا فاتر العقل قرار دیتی ہے۔ غائب دماغ پروفیسر۔ سرکاری محکمہ جات کی لال فیتہ والی مثلیں۔ عدالت کی کارروائیاں۔ مکتبوں میں غرض کہ ہر جگہ ہنسنے ہنسانے کا سامان موجود رہتا ہے اور دنیا لطیفوں سے بھری پڑی ہے بشرطیکہ احساسِ ظرافت موجود ہو ہنسنے ہنسانے کا موڈ ہو اور غم روزگار سے فرصت ہو لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ عمدہ اور معیاری لطیفوں کی تالیف ترتیب وتدوین بڑا ہی کٹھن کام ہے۔ چنانچہ میرے لئے سب سے زیادہ حیران کن مسئلہ یہی تھا کہ کسے اس گلدان ظرافت میں رکھوں اور کسے نظر انداز کر دوں۔ سب سے پہلی مشکل تو یہ تھی کہ مغربی انداز اور طرزِ معاشرت کے لطیفے ہماری تہذیب سے میل نہیں کھاتے اور احساسِ ظرافت کو چھوتے بھی نہیں۔ ان میں سے بیشتر کو اردو زبان میں منتقل بھی نہیں کیا جاسکتا بعض صرف سُنے جا سکتے ہیں قلم بند نہیں کئے جا سکتے۔

بیشتر لطیفوں کے بیان کے ساتھ حرکات وسکنات اشارات وکنایات کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ اور پھر سب سے بڑی

بات بہت سارے لطیفے اتنے گھٹیا اور پست ہوتے ہیں کہ کسی اچھی محفل میں سنائے نہیں جا سکتے۔ اور پھر ایسی کمپیوٹر مشین ابھی تک ایجاد نہیں ہوئی جو معیاری اور غیر معیاری لطیفوں کو چھانٹ کر الگ الگ کر کے رکھ دے۔ اس لئے ان لطیفوں کو ذہنی مشین ہی پر جانچنا اور پرکھنا پڑتا ہے۔ مدّت سے جو ردِّ عمل مشاہدے میں آتے رہے ان ہی کا سہارا لے کر اپنے معیار کو قائم کرنا پڑتا ہے۔

کیا اچھا ہو کہ یہ کسوٹی آپ کے بھی مذاق اور معیار کے مطابق ہو۔ اس کتاب کے پڑھنے سے اگر آپ کی زندگی کے کچھ لمحوں میں مسکراہٹ اور ہنسی شامل ہو جائے تو سمجھوں گا کہ میری محنت چیز ہو گئی۔ اگر کوئی لطیفہ آپ کو پسند نہ آئے تو اسے کسی اور کو سنا کر مجھ سے ضرور انتقام لیجئے۔ یہ سلسلہ اسی طرح جاری رکھئے جس طرح دکاندار اپنی دکانوں میں لکھ کر لگاتے ہیں۔

"اگر ہر چیز پسند خاطر ہو تو اوروں کو بتائیے اور جو کوئی بات ناپسند ہو تو ہمیں بتلائیے۔"

ظرافت اور مزاح کا صحیح لطف تو مزاح نگاروں کے فکر و شعور اور ان کے ادبی شہ پاروں میں ہے پطرس رشید احمد صدیقی۔ عظیم بیگ چغتائی۔ شوکت تھانوی۔ فرحت اللہ بیگ

کنھیا لال کپور۔ بھارت چند کھنہ۔ مجتبیٰ حسین۔ مشتاق احمد یوسفی
غلام احمد فرقت۔ شفیق الرحمن۔ یوسف ناظم سبھی اس میدان
کے شہ سوار ہیں اور اپنے پرستاروں کا ایک بڑا حلقہ رکھتے ہیں
لیکن ادبی ظرافت اور مزاح کی دشواری یہ ہے کہ یہ بڑی جانفشانی
اور محنت کا کام ہے۔ ان ادیبوں کو اپنے مضمون کے ذریعہ ایک سماں
باندھنا پڑتا ہے۔ اور مضمون کے اختتام تک مزاح کے بلند معیار
اور ظرافت کی اس فضاء کو برقرار رکھنا پڑتا ہے۔ ان کی کاوشِ
قلم کو فنی آداب کے پردوں میں بکھرنا پڑتا ہے۔ برخلاف اسکے
لطیفہ گوئی میں ایسی کوئی جھنجھٹ نہیں۔ لطیفہ گوئی کیلئے کسی
وجدان کی ضرورت نہیں۔ مجھ جیسا شخص بھی اس میدان میں کود
پڑے تو بڑی دیر تک حالات پر قابو رکھ سکتا ہے اور اس کے بعد
امدادِ باہمی کے عمل پر سلسلہ جاری رہ سکتا ہے۔ اگر سننے والوں نے
ساتھ دیا تو سمجھئے کہ ہم نے میدان مار لیا۔ اور جو کسی نے بیچ میں
ٹوک دیا کہ ارے یہ قصہ یوں نہیں یوں ہے یا ہم نے لطیفہ سنانا
شروع کیا اور حاضرینِ محفل میں سے کسی نے انجام بتا دیا
تب تو لطیفہ ہی نہیں لطیفہ گو بھی ڈھیر ہو جاتا ہے۔

لیکن لطیفے سنانے والوں کو بھی یہ بات یاد رہنی چاہئے
کہ سننے والے اس طرح بور نہ ہو جائیں کہ جس طرح شاعر کا

کلام سننے سے تانگے والے نے انکار کردیا تھا۔ ان شاعر صاحب کا قصہ بہت دلچسپ ہے انہوں نے لکھنؤ اسٹیشن پر ایک تانگہ دو روپیہ کرایہ پر لیا اور ساتھ ہی یہ بھی طے ہوا کہ راستے بھر تانگہ والا اُن کے اشعار سنے گا۔ اس بات کے مزید دو روپے شاعر نے پیشگی ادا کر دیئے اور تانگہ منزل کی طرف روانہ ہوا۔ ادھر شاعر کی بیاض کھل گئی نظم پر نظم۔ غزل پر غزل درمیان میں رباعیات قطعات۔ تانگہ والے نے دو روپے کی خاطر کچھ دیر تو داد و تحسین کا سلسلہ جاری رکھا۔ لیکن جب اس کی داد نے شاعر کو مزید بے داد پر اکسایا اور وہ کسی طرح اپنا کلام سنانے سے باز نہیں آیا تو تانگہ راں نے ہاتھ جوڑے اور عرض کیا:

"حضور یہ آپ کے دو روپے واپس ہیں انہیں قبول فرمایئے اور میری جان بخشئے۔"

لطیفہ گو بھی کبھی کبھار اپنے سننے والوں کو معافی مانگنے پر مجبور کر دیتے ہیں حالانکہ لطیفہ گوئی اور شعر گوئی میں دُور کا بھی تعلق نہیں۔

شعر کے تو موڈ ہی مختلف ہوتے ہیں عاشقانہ۔ ناصحانہ صوفیانہ۔ ظریفانہ۔ سنجیدہ۔ رنجیدہ۔ کبیدہ۔ لیکن لطیفہ کا موڈ ایک ہی ہوتا ہے ہنسی اور مزاح۔

بجائے خود نہ تو شاعری بری چیز ہے نہ لطیفہ گوئی لیکن انہیں بوریت کے درجہ پر پہنچا دینا آدمی کا اپنا فعل ہوتا ہے۔ اگر اس کتاب کے مطالعہ نے آپ کے مزاج میں شگفتگی کے بجائے بیزاری پیدا کی ہے تو سمجھئے گا قصوروار میں ہوں۔ لطیفے نہیں۔ اور صنف لطیفہ تو ہرگز بھی نہیں۔ کہیں آپ مزاجاً امریکی تو نہیں؟ مشہور عالم ہیومرسٹ (ظریف) اسٹیفن لی کاک کا کہنا ہے کہ امریکی بڑے عجیب وغریب لوگ ہیں ان کے پاس زیادہ سے زیادہ وقت ہے۔ دولت ہے فرصت ہے سب کچھ ہے لیکن وہ آرام کرنا جانتے ہیں اور نہ ہنسنا وہ کسی مسخرے کو نوکر رکھ لیتے ہیں اور اسکو ہنستا ہوا دیکھنے ہی پر اکتفا کرتے ہیں۔ خود ہنسنا ان کو گوارا نہیں ہوتا۔ خدا کرے کہ آپ اتنے دولت مند نہ ہوں!!

لطیفہ گوئی کے جنوں میں جب کوئی شخص بری طرح پھنس جاتا ہے تو وہ خود کوئی لطیفہ سننا برداشت نہیں کر سکتا۔ محفل میں کسی دوسرے کو لطیفہ سنانے کا موقعہ دینا یا کسی اور سے لطیفہ سنکر اسکے جواب میں خود دو درجن لطیفے نہ سنانا اسکے بس کی بات نہیں ہوتی۔ وہ ایک ہی لطیفے کو ایک ہی محفل میں تین بار سنانے سے نہیں چوکتا۔ یہ مرض جب بہت کہنہ ہو جاتا ہے اور اسکے دس پانچ مریض اکٹھے ہو جاتے ہیں تو وہ دھڑا دھڑ لطیفوں

کی بارش کر دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ شروع کرنے سے پہلے ہی لطیفہ گو کے چہرہ کے اتار چڑھاؤ سے بھانپ جاتے ہیں کہ اب کونسا لطیفہ نازل ہونے والا ہے۔ اسی قسم کے ایک حلقۂ احباب میں تو بالآخر لطیفوں کو نمبر دے دیئے گئے اور جب کبھی یہ محفل جمتی ایک صاحب چلاتے نمبر ۲ اس پر کچھ لوگ رفعِ شر کیلئے ہنستے تو فوراً ہی دوسرے صاحب پکارتے نمبر ۱۲۔ اب اگر یہ دلچسپ لطیفہ ہے تو باوجود سنا ہوا ہونیکے کچھ لوگ اخلاقاً ہنس پڑتے یا صرف دانت دکھانے پر اکتفا کرتے غرض کہ موقع محل فرصت اور بیکاری کی مناسبت سے یہ محفل جمی رہتی وہ مزا نہ آتا جو آمد میں ہوتا ہے۔

ایک مقام وہ بھی ہے کہ جہاں لطیفہ تو سامعین سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ تنہا بیٹھا بیٹھا اپنے آپ کو لطیفے سناتا رہتا ہے۔ ہنستا ہے۔ منہ بناتا ہے بگاڑتا ہے۔ ہاتھ نچاتا ہے۔ اس عالم میں لطیفہ گو کو دیکھ کر جو آپ پوچھ بیٹھے کہ یہ کیا ماجرا ہے تو وہ بڑی معصومیت سے آپ کو بتائے گا۔" وقت گزاری کیلئے اور اپنے موڈ کو ٹھیک کرنیکے لئے کچھ لطیفے اپنے آپ کو سنا رہا ہوں لطیفہ اچھا ہوتا ہے تو ہنس دیتا ہوں روکھا پھیکا ہوتا ہے تو منہ بنا تا ہوں اور کئی بار سنا ہوا ہوتا ہے تو بیچ بیچ میں خود کو ہاتھ بتا کر قطع کلام کر دیتا ہوں۔

اِس کتاب کے سِلسلے میں مجھ پر بھی اس قسم کے موڈ آتے رہے ہیں کہ جب ذہنی مشق کے طور پر اگلے پچھلے سب ہی لطیفوں کو دہرا تار ہا ہوں اور چہرہ پر اسی طرح کے اتار چڑھاؤ دیکھ کر میرے دوستوں نے کچھ دِنوں تو ملنا جلنا قطعی طور پر ترک کر دیا تھا۔

اِس بُلند مرتبہ پر پہنچنے کیلئے بے شک برسہا برس کی لطیفہ گوئی کی مشق اور تجرُبہ چاہئے۔

کسی دفتر کے حاکم اعلیٰ کو بھی اِس قسم کا مرض لاحق تھا اور اُنہوں نے اپنے ماتحتین کو اپنے سامعین کے زمرہ میں شریک کر رکھا تھا' ادھر اُدھر سے سُنے ہوئے لطیفے اُن بیچاروں کی سامعہ خراشی کے لئے اِستعمال کرتے۔ کبھی آخر کا حصّہ پہلے تو کبھی شروع کا حصّہ آخر میں سناتے اپنی اپنی نوکری کی خاطر سب ہی ہنستے اور داد دیتے۔ ایک دِن اِسی طرح لطیفہ گوئی ہو رہی تھی سب ہی ہنسنے کا ڈھونگ رچا رہے تھے لیکن ایک صاحب غیر معمولی طور پر بالکل خاموش اور بے توجہ سے بیٹھے رہے۔ ہنسنے یا مُسکرانے کا دکھاوا بھی نہیں تھا۔ کسی نے چُپکے سے پوچھا "آپ ہنستے کیوں نہیں؟" اُنہوں نے بآوازِ بلند جواب دیا "میں تو کل سے ریٹائر ہو رہا ہوں

پھر میں کیوں ہنسوں"۔

لطیفہ سنانے کیلئے مناسب اندازِ بیان از حد ضروری ہے بلکہ لطیفہ صرف اسی شخص کو سنانا چاہیئے کہ جو اسے اس ڈھنگ سے سنا سکے کہ لطیفہ کا مزہ دوبالا ہو جائے۔ ورنہ ایسے لوگ بھی ہیں جو دوسروں کی مدد سے لطیفہ سُنانا چاہتے ہیں یا سُنانے سے پہلے خود ہی کھلکھلا کر ہنس پڑتے ہیں۔ اور پھر اِس بری طرح لطیفہ صادر فرماتے ہیں کہ سارا مزا کِرکِرا ہو جاتا ہے۔ ورنہ لطیفہ تو ایسی چیز ہے کہ جو بیمار آدمی کو صحت مند بنا دے حیدر آباد کے ہر دلعزیز ڈاکٹر عبدالمنان یا بمبئی کے ڈاکٹر موثوق الدین کا ایسے ڈاکٹروں میں شمار ہو سکتا ہے کہ جن کے چہرہ بشاشت پرخلوص رویہ اور دل لگا کر تشخیص کرنے کے عمل سے اور لطیفہ گری سے شفاء کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ ڈاکٹر منان تو فی الواقعی ایک عرصہ تک محلّہ دارالشفاء ہی میں رہا کیئے۔ لہٰذا تمام ڈاکٹروں سے یہی استدعا ہے کہ وہ اپنے نسخوں میں دواؤں کے ساتھ ساتھ اس مجموعے کے کچھ لطیفے بھی تجویز کر دیا کریں تاکہ عیسائی مشن میں جو "دُعا و دوا" کا عمل ہوتا ہے اُس سے بھی یہ تدبیر اکسیر ہو جائے۔

میں اپنے ایک اور دوست ایم منال کا بھی ذکر کرنا چاہونگا کہ جو مجرّب اور کارگر دوائیاں بنا کر بیچتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ لطیفوں

کو بھی جمع اور تقسیم کرتے ہیں اپنے ہیومر ان لمیٹڈ (ظرافت غیر محدود
یا مزاح لامحدود) کے ذریعہ چُنندہ لطیفے جمع کرتے ہیں اور نہایت
فیاضی اور بے دردی سے کاری ضرب لگاتے ہیں۔ بھلا ہو اُن کا
کہ ان کی گرم جوشی مستقل مزاجی سعی و کاوش نے لطیفہ گوئی
کو بمبئی کے ممتاز حلقوں میں مقبول اور عام کر دیا ہے۔ اسمیں پدم
بھوشن پنڈت شیو شرما۔ مشہور اداکار ڈیوڈ۔ مسٹر ڈاکٹر۔ نو لکھیا
صادق قاضی وغیرہ جیسی مشہور ہستیاں بھی شریک ہیں۔

حیدرآباد میں پچھلے ۳ سال سے فائن آرٹس اکیڈمی کے
کرتا دھرتا زندہ دلان حیدرآباد اور حلقۂ ارباب ذوق کی طرف سے
مزاح نگاروں کی کل ہند کانفرنسیں منعقد ہوتی رہی ہیں جس
میں مزاحیہ مشاعرے اور جشنِ مزاح کے تحت لطیفہ گوئی اور طنز
و مزاح کے دلچسپ مضامین پڑھے جاتے رہے ہیں۔ اور مزاح
کا معیار او نچے سے اونچا بنایا جا تا رہا ہے۔ اس میں یدہ وبر
اور کرشن چندر کے علاوہ عثمانیہ یونیورسٹی کے بزرگال ح زمانہ
مخدوم۔ راجِ بہادر گوڑ۔ شکور بیگ۔ علی صائب میاں اور
درمیانی دور کے عابد علی خاں، بھارت چند کھنہ، یوسف ناظم، رشید
قریشی۔ احمد جمال پاشاہ۔ سلمیٰ صدیقی۔ زینت ساجدہ سلیمان ح
خطیب وغیرہ اور دورِ حاضرہ کے نوجوان زاہد علی خاں مجتبیٰ حسین

وغیرہ کی کاوشیں بہت نمایاں ہیں۔ انہوں نے مزاح اور ظرافت کے دریا بہائے ہیں اور لوگوں کو ہنسنے ہنسانے کا سلیقہ دیا ہے۔ لیکن بالکلیہ لطیفہ گوئی کے سِشن کو عام کرنے اور اس فن لطیف کو ہر دلعزیز بنانے کیلئے میں اپنی کاوشوں کو آپ کی خدمات میں پیش کر رہا ہوں اور میرے انتساب کا آدرش پورا ہو جائے تو یہ میری زندگی کا منتہٰی ہو گا۔

صنفِ لطیفہ میں سب سے زیادہ دلچسپ وہ ہیں کہ جو ننھے منّے بچّوں کی زبان سے بے ساختہ خود بخود نکلی ہوئی باتوں پر مبنی ہوتے ہیں اور جو خرد مندوں کے ہوش و حواس ٹھکانے لگا دیتے ہیں۔

چنانچہ معصوم بچّوں کے مُنہ سے نکلی ہوئی لطیف باتوں میں مجھے خاص طور پر یہ بات خوب یاد ہے کہ گھر میں ماں باپ کو یہ کہتے ہوئے ننھے میاں نے سُن لیا کہ اُن کے باپ کے جو حاکمِ اعلیٰ ہیں ان کے حیطۂ اقتدار میں ان کی ترقّی کا مسئلہ ہے اور اگر ان کو دعوت دے کر گھر بلایا جائے اور اُن کو خوب مسکہ لگایا جائے تو ضرور ترقّی کا راستہ کھل جائے گا۔

چنانچہ دعوت ہوئی بہت بڑھیا کھانے بڑے اہتمام سے بنے۔ پُر تکلّف لوازمات رکھّے گئے اور سارا وقت حاکمِ اعلیٰ کی تعریف و توصیف ہوتی رہی اور جب کھانا ختم ہوا تو ننّھے میاں سے رہا نہ گیا وہ پوچھ بیٹھے "ابا جی کھانا تو ختم بھی ہو گیا اور آپ نے صاحب کو مسکہ تو لگایا ہی نہیں وہ تو جیسے کا تیسا ہی رکھا ہے۔"

ننّھا راجو کچھ جھوٹ باتیں کہنے لگا تھا۔ باپ نے ڈانٹا "ہم جب تمہاری عمر کے تھے تو کبھی جھوٹ نہیں بولتے تھے"

اس پر ننھے راجو پوچھ بیٹھے "تو پھر باپوجی آپ نے کس عمر سے جھوٹ بولنا شروع کیا؟"

ایک بار انہیں سرکس لے جایا گیا وہاں پر مسخرے کافی الٹی سُلٹی حرکتیں کر رہے تھے کبھی برتن توڑ پھوڑ کرتے۔ کبھی آپس میں مار پیٹ کی۔ کبھی سیکل توڑ ڈالی اس پر خوب قہقہے ہوتے رہے ہر ایک کا ہنسی کے مارے بُرا حال تھا۔ اس پر انہوں نے بڑی سنجیدگی سے باپوجی سے پوچھا "وہ جو کبھی ہم ایسی کوئی حرکت کرتے ہیں تو نہ صرف ڈانٹ پلائی جاتی ہے بلکہ مار بھی پڑتی ہے اور یہاں پر انہیں حرکتوں کے مزے لئے جا رہے ہیں۔"

والدِ محترم کے عنفوانِ شباب کی حسین تصویر البم میں لگی تھی۔ ننھے میاں البم اُلٹ پلٹ کرتے کرتے اس تصویر کو دیکھ کر پوچھ ہی بیٹھے "یہ تصویر کس کی ہے"۔ ماں نے بتایا "بیٹا یہ تو تمہارے ابّا جان ہیں۔"

بچّے نے پہلے تو تصویر کو غور سے دیکھا۔ پھر چشمہ لگائے ہوئے پھٹی پھٹی آنکھوں والے، گنجے سر چگی داڑھی والے عُمر رسیدہ آدمی کی طرف دیکھ کر ننھے میاں نے سوال کیا:

"تو امّی جان! یہ صاحب جو آج کل ہمارے ساتھ رہتے ہیں یہ کون ہیں؟"۔

لڑکے نے دریافت کیا " ماں تم کہاں پیدا ہوئی تھیں؟"
ماں نے بتایا۔ "کلکتہ"۔ اُس نے پھر پوچھا " ابا کہاں پیدا ہوئے تھے"
ماں نے کہا۔ "دلی"۔ اِس پر اسنے خود اپنی جائے پیدائش
کی بابت سوال کیا، تو ماں نے کہا۔ "بمبئی"۔
بڑے تعجب سے لڑکے نے پوچھا " تو امی جان یہ ہم سب
یکجا کیسے ہو گئے؟"

ایک ننھے لڑکے کو اپنے مُنہ میں انگوٹھا لے کر چُوستے
رہنے کی بُری عادت ہو گئی تھی۔ ماں نے لاکھ جتن کئے سیکڑوں
خرابیاں اور بدنمائیاں بتائیں لیکن وہ اِس سے باز ہی نہ آتا۔
ایک دن بڑی سختی سے اسکو کہا کہ اگر یہ عادت نہ چھوڑو گے
تو پیٹ پھول جائیگا اور تم گول پیپے جیسے ہو جاؤ گے۔ یہ بات
کچھ اسکو لگی اور گھبرا کر اس نے انگوٹھا چوسنا بالکل چھوڑ دیا۔
کچھ دنوں بعد اُن کے گھر کوئی ملاقاتی آئی۔ اُسنے غور سے
دیکھا تو مہمان عورت حاملہ ہونے کی وجہ سے اُسکا پیٹ بڑا اور
پھولا ہوا دکھا۔ یہ اُس کے قریب گئے اور بڑی رازداری کے طور پر
پیٹ کی طرف اشارہ کر کے کہا:
" ہا ہا میں جانتا ہوں کہ آپ کیا کرتی رہی ہیں اور
آپ کا پیٹ کیوں پھول گیا ہے"۔

امتحان سے فارغ ہو کر ننھّے میاں پریشان صورت گھر
پہنچے تو ہم نے پوچھا۔ "کیا سوال بہت مشکل تھے؟"
جواب ملا "سوال تو بہت آسان تھے لیکن جواب بہت مشکل تھے"

سڑک سے لوگ میّت کو کاندھے پر لئے جا رہے
تھے چھوٹے لڑکے نے پوچھا۔ "ابا جان یہ اپنے پڑوسی کو اس طرح
کہاں لئے جا رہے ہیں؟" باپ نے اپنے خاص موڈ میں بتایا:
"بیٹا یہ اسکو ایسی جگہ لے جا رہے ہیں کہ جہاں پر نہ تو در و دیوار
ہیں نہ چھت۔ نہ کوئی پڑوسی نہ غم گسار۔ کھانا ہے نہ پینا۔ جہاں
اندھیرا ہی اندھیرا ہے"۔ اس پر لڑکے نے کچھ سوچ کر پوچھا:
"تو کیا یہ اسکو ہمارے گھر لے جا رہے ہیں؟"

جیسے کہ عرض کیا جا چکا ہے کسی واقعہ کو ایک خاص ہستی یا شخصیت سے چسپاں کر کے بیان کیا جائے تو اس کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔

کسی زمانہ میں حیدر آباد میں جمال الدین صاحب ناظمِ باغاتِ عامّہ ہوا کرتے تھے۔ ان کے عہدے کی مناسبت سے یہ قصّہ بہت مقبول ہوا کہ اُن کے باغ کے تمام مالیوں کو بیکار بیٹھے بیڑی پیتے دیکھ کر اُن کے نکمّے پن پر انہیں بڑا غصّہ آیا۔ یہ ڈانٹ کر بولے "تم لوگ درختوں کو پانی ڈالنے کا کام کیوں نہیں کرتے؟"

مالیوں نے بتایا "صاحب بارش ہو رہی ہے اسلئے ہم یہاں بیٹھے ہیں"۔ اس پر اور بھی طیش میں آئے اور کہا "بارش ہو رہی ہے تو چھتری لے کر درختوں کو پانی کیوں نہیں دیتے؟"

ایک اور موقعہ پر باغ میں کچھ گڑھے کھودے جا رہے تھے اور مزدور مٹی کو بہت دور لے جا کر پھینک رہے تھے۔ انہوں نے دیکھا اس میں بہت سارا وقت ضائع ہو رہا ہے اور ڈانٹ کر بولے۔ "تم لوگ بڑے کام چور ہو۔ اس طرح وقت خراب کر رہے ہو، یہیں قریب ہی میں ایک اور گڑھا کھود کر یہ مٹی اس میں کیوں نہیں ڈال دیتے"۔

ایک بار یہ کسی جگہ مدعو تھے اور بطورِ خاص نئے اور بڑھیا

کپڑوں میں ملبوس۔ کسی نے دیکھا اُن کے ایک پیر میں سفید موزہ ہے اور دوسرے میں کالا۔ حیرت سے پوچھا "کیا یہ نیا فیشن ہے؟" آپ نے بھی اپنے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا "میں خود پریشان ہوں، گھر پر بھی ایک ایسا جوڑا رکھا ہے"۔

اُن کے کسی دوست کی بیوی کا انتقال ہو گیا چھوٹے چھوٹے بچوں کی ذمہ داری تھی، دوستوں نے مجبور کیا کہ پھر سے شادی کر لو۔ بڑی مشکل سے یہ راضی تو ہوئے مگر یہ شرط پیش کی کہ کسی بیوہ ہی سے شادی کرونگا۔ دوستوں نے بہت چھان بین کی لیکن کوئی بیوہ تو ملی نہیں البتہ ہر لحاظ سے موزوں جوڑ کی کنواری لڑکی کو ڈھونڈھ نکالا۔ مگر ان کا اصرار قائم تھا کہ بیوہ ہی چاہیئے۔ اِن سے جب یہ ماجرا سنا کر مشورہ طلب کیا گیا تو انہوں نے بڑا مناسب تصفیہ کیا۔

"بھئی تم اِس کنواری لڑکی سے ہی فی الحال شادی کر لو ہمارا ذمہ کہ اسکو بیوہ بنا دینگے"۔

ان ہی کا قصہ ہے کہ یہ اپنے کسی اچھے دوست کے گھر کھانے پر مدعو تھے۔ کھانا ختم ہوتے ہوتے بڑی رات ہو گئی سب مہمان جا چکے اور بارش کی وجہ سے یہ رکے رہے کہ تھم جائے تو اپنے گھر جائیں اور موسلا دھار طوفانی بارش رکنے کا نام ہی نہ لیتی

تھی۔ گویہ قریب رہتے تھے لیکن سواری کا انتظام نہ ہو سکا۔ میزبان نے مجبور کیا کہ بھیگتے جانے کے بجائے رات بھر اُنہیں کے ہاں قیام کرلیں۔ اور جو بدقت تمام کسی طرح راضی ہوئے تو بستر وغیرہ کا انتظام کرنے کیلئے میزبان اندر جا کر کچھ دیر بعد باہر آئے تو ان کو لاپتہ پایا۔ سمجھا کہ شاید ان کو جانے کی دھن لگی تھی چلے گئے ہوں لیکن تھوڑی دیر بعد دیکھتے کیا ہیں کہ یہ پانی میں شرابور موجود ہیں۔ معلوم ہوا کہ شب خوابی کے کپڑے لانے گھر گئے تھے۔

ایک بار ان کے کسی گہرے دوست کے والد کے انتقال کی خبر ملی۔ یہ کہیں اور مصروف تھے اپنے چھوٹے بھائی سے کہہ دیا کہ وہ جا کر پُرسہ دے اور کفن دفن میں شریک رہے۔ بھائی گئے تو گھر میں ماتم تھا۔ سب چھوٹے بڑے غم کے مارے رو رہے تھے۔ یہ کچھ دیر تو خاموش بیٹھے پھر ادھر اُدھر کی گپ شپ شروع کر دی۔ نئی فلموں کی تعریف کی کسی کلچرل پروگرام کی بُرائی کرتے رہے۔ کچھ گانوں کی دھنوں کی تعریف کی۔ غرض اسی قسم کی اوٹ پٹانگ باتیں کر کے واپس ہو گئے۔ بعد میں جب بڑے بھائی سے ان کے دوست کی ملاقات ہوئی تو انہوں نے پھر سے اظہارِ تاسف کیا اور اپنے نہ جانے کی معذرت چاہی۔ یہ دوست

تو خار کھائے بیٹھے تھے انہوں نے کہا "آپ کے چھوٹے بھائی بھی خوب آدمی ہیں وہ تو پرسہ دینے آئے تھے اور کھیل تماشہ کی باتیں کرتے رہے"۔ بڑے بھائی کو یہ سُنکر بڑا دکھ ہوا۔ معافی چاہی اور یقین دلایا کہ آیندہ جب کبھی آپ کے گھر میں ایسا کوئی سانحہ ہوا تو وہ اپنے بھائی کو ہرگز نہیں بھیجیں گے بلکہ خود حاضر رہیں گے۔

اسکے بر عکس ایک بار کسی دوست نے شکایت کی کہ یہ ان کے لڑکے کی شادی میں شریک نہیں ہوئے تو انہوں نے اس موقعہ پر بھی معذرت چاہتے ہوئے یقین دلایا کہ اُن کے صاحبزادے کی آئندہ ہونے والی تمام شادیوں میں ضرور شرکت کرینگے۔

کہا یہ جاتا ہے کہ یہ سفر سے گھر پہنچے تو بیوی نے پُوچھا سفر کیسا کٹا۔ انہوں نے بتایا کہ ان کو سفر میں بڑی تکلیف رہی ریل میں اُوپر والی برتھ ملی ہوئی تھی اور رات بھر پیٹ کی خرابی کی وجہ سے ان کو رفع حاجت کے لئے بار بار نیچے اترنا پڑتا تھا۔ بیوی نے کہا "اتنی ہی تکلیف تھی تو نیچے کی برتھ والے مسافر سے درخواست کرکے سیٹ بدل لی ہوتی"۔

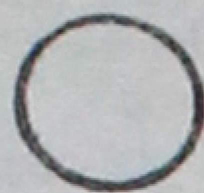
انہوں نے کہا "یہ خیال تو مجھے بھی آیا لیکن نیچے والی سیٹ پر کوئی تھا ہی نہیں، سیٹ کس سے بدل لیتا"؟

جمال الدین صاحب سے کسی نے آکر بتایا کہ اُن کا تبادلہ نظامتِ باغ عامہ سے کسی اور جگہ ہو رہا ہے اور ان کی جگہ مجاھد علی عاقل آ رہے ہیں۔ انہوں نے جھٹ سے کہا:

ع "ماراچہ ازیں قصّہ کہ گاؤ آمد و خر رفت"

جمال الدین صاحب نے ایک شخص کو پہچان کر سلام کیا اور پوچھا۔ "رنجن تم کتنے بدل گئے ہو۔ موٹاپا آ گیا ہے پہلے تم گنجے تھے اب تو سر پر بال بھی اُگ آئے ہیں۔ پہلے تو عینک لگاتے تھے اب تو بغیر عینک کے ہو؟"

اُس شخص نے کہا "معاف کیجئے میرا نام رنجن نہیں"۔ "اوہ تب تو تم اتنے بدل گئے ہو کہ تمہارا پرانا نام بھی رنجن نہیں رہا۔"



بعض لوگ خود مجسّم لطیفہ گر ہوتے ہیں اور ہنسنے ہنسانے کیلئے سوال جواب کر کے دوسروں کو بے وقوف بنا ڈالتے ہیں یا اُن کو یہ محسوس کرا کے چھوڑ دیتے ہیں کہ اُن میں شئے لطیف کی یا سمجھ بوجھ کی کمی ہے۔ ہمارے ایک دوست جب کبھی نئے نئے لوگوں کی محفل میں ہوتے ہیں تو بطور تمہید شروع کرتے ہیں کہ مختلف لوگوں کی عادتیں نرالی ہوتی ہیں اور ہر ایک میں کچھ کچھ سنک ہوتی ہے۔ مثلاً کچھ لوگ اپنی چائے کی شکر کو دائیں ہاتھ سے ہلاتے ہیں اور کچھ لوگ بائیں ہاتھ سے۔ آپ کیا کرتے ہیں؟ اب جن سے یہ سوال کیا جاتا وہ کچھ دیر سوچ میں پڑ جاتے اور پھر کوئی کہتا کہ ہم سیدھے ہاتھ سے اپنی چائے کی شکر کو ہلاتے ہیں اور کوئی کہتا کہ ہم تو بائیں ہاتھ سے ہلاتے ہیں۔ اب یہ اِس بات کو پکڑ کر کھینچتے ہیں:

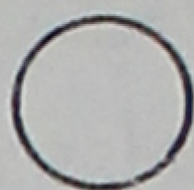
"اجی آج ہم کِن لوگوں کی صحبت میں بیٹھے ہیں، کیا آپ صاحبان کو اتنی بھی تمیز نہیں کہ چائے کی شکر کو ہمیشہ چمچے سے ہلانا چاہیئے۔"

ایک بار انہوں نے پوچھا "میری موٹر کے ڈرائیور کی عمر ۴۰ سال ہے۔ وہ موٹر ۵۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے کم پر نہیں چلاتا ہر سال موٹر کی درستگی کیلئے ۵ ہزار روپیہ برباد کرتا ہے تو بتایئے کہ میری عمر کیا ہے؟" یہ سمجھتے تھے کہ ان سے مزید سوال کیے جائینگے۔ اور یہ سب کو بے وقوف بنائیں گے۔ لیکن ایک صاحب نے جھٹ سے جواب دیا "آپ کی عمر ۵۰ سال ہے۔" اب یہ چکرائے اور پوچھا کہ وہ کس حساب سے؟

وہ صاحب بولے "ہمارے محلہ میں ایک شخص رہتا ہے وہ ایسی ہی واہی تباہی باتیں کرتا ہے، نیم پاگل سا ہے۔ اُس کی عمر ۲۵ سال کی ہے اور آپ تو مکمل پاگل نظر آتے ہیں اسلیئے آپ کی عمر اُس سے دگنی ہوئی۔"

ایک بار انہوں نے دکاندار سے بائیں طرف سے پکڑنے والی ڈنڈی کی پیالیاں طلب کیں۔ دکاندار حیران و پریشان ہوا اور معذرت چاہی۔ اُنہوں نے دو چار دکانداروں کو اسی طرح تنگ کیا بالآخر ایک دکاندار نے موقعہ کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے درجن بھر پیالیاں اندر کہیں گودام سے نکال لایا اور سب کی سب کو اس طرح جمایا کہ اُن کی ڈنڈیاں بائیں طرف تھیں اور کہا "صاحب عجیب حسنِ اتفاق ہے کہ یہ

مال ایک مدّت سے اسی طرح پڑا تھا۔ اس کا کوئی خواہشمند، قدر داں آیا ہی نہیں، اب آپ آئے ہیں تو لے جائیے۔ قیمت اور بھاؤ کی بالکل پرواہ نہ کیجئے۔ یہ نایاب چیز ہے۔" ہمارے دوست کو خواہ مخواہ گراں قیمت دے کر لینا ہی پڑا۔



اساتذہ اور پروفیسر اپنی اعلیٰ دماغی صلاحیتوں فکر و علم کے باوجود بالعموم غائب دماغی کا شکار ہو جاتے ہیں اور عملی دُنیا میں ناکام ثابت ہوتے ہیں۔

ریاضی کے پروفیسر پیدل سفر پر جا رہے تھے راستے میں ایک ندی ملی جس میں پانی بھرپور تھا یہ تیرنا بالکل نہ جانتے تھے۔ پھر بھی خیال کیا کہ شاید چل کر پار ہو جائیں۔ لوگوں سے ندی کی گہرائی پوچھی اور پھر خود حساب کرنے بیٹھ گئے۔ کنارے انہوں نے ایک فٹ۔ آگے دو فٹ اور آگے چار فٹ اور بیچ میں چھ فٹ گہرائی کو۔ جوڑ کر انہوں نے اوسط نکالا تو گہرائی صرف سوا تین فٹ نکلی۔ یہ بے دھڑک ندی میں اتر گئے۔ کہ سوا تین فٹ اوسط پانی کی گہرائی سے تو وہ بغیر تیرنا جاننے کے بھی پار ہو سکتے ہیں۔ بہتی ندی کے ۶ فٹ گہرے پانی میں ان کا کیا حشر ہوا ہوگا اسکے بیان کی چنداں ضرورت نہیں۔

دُنیا کے سب سے بڑے سائنسداں آئن سٹائن کا سچا قصّہ تو سب ہی کو معلوم ہے کہ جب وہ اپنے سائنس کے

تجربے کرنے کیلئے بند اور تاریک کمرہ میں مصروف ہو جاتا تو
اس کی پالتو بلی دروازے پر میاؤں میاؤں کیا کرتی۔ بار بار
دروازہ کھولنے بند کرنے کی زحمت سے بچنے کیلئے انہوں نے
دروازہ میں ایک چھوٹا سا سوراخ کر دیا کہ بلی جب چاہے آئے اور
چلی جائے۔ کچھ دنوں بعد اُس بلی نے بچے دیئے اور جب یہ بچے
بڑے ہو کر ماں کے ساتھ گھومنے لگے تو آئن سٹائن نے
بڑے سوراخ کے بازو چھوٹے چھوٹے اور بھی سوراخ بنائے تاکہ
بچے بھی اندر آسکیں۔

کلیہ جامعہ عثمانیہ کے پرو وائس چانسلر قاضی محمد حسین
کی غائب دماغی تو ہم نے آنکھوں دیکھی ہے۔ یہ اپنے آفس
روم میں داخل ہوتے تو ایک مقررہ کونہ کی جگہ پر اپنی چھڑی رکھ دیتے
اور خود کرسی پر جا بیٹھتے۔ ایک دن نہ معلوم کس دھن میں تھے
کہ اپنی کرسی پر چھڑی رکھ دی اور خود چھڑی کی جگہ پر جا کر بے حس
و حرکت کھڑے ہو گئے۔

ایک دن اُن ہی کے آفس پر ٹھیک ۳ بجے ایک
میٹنگ تھی۔ کسی اور کام میں میٹنگ کا دھیان نہ رہا اور جیسے ہی خیال
آیا یہ سیدھے باہر بھاگے چپراسی سے موٹر لانے کو کہا اور جب موٹر آگئی
تو ڈرائیور سے کہا کہ جلد سے جلد آفس پہنچا دے۔ اتنی دیر میں

ڈرائیور نے موٹر کا انجن چالو کر دیا تھا اور جو سنا کہ آفس چلنا ہے تو اس نے موٹر بند کیا اور ان کی توجہ دلانے کے لیے کہ وہ آفس پر ہی ہیں ان کی طرف کا دروازہ کھولا۔ یہ خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہ ڈرائیور نے بہت تیزی کے ساتھ اُن کو آفس پہونچا دیا۔ موٹر سے اتر کر پھر اپنے کمرہ کو ٹمنگ کیلئے چلے گئے اور اس تیزی پر ڈرائیور کی بڑی تعریف کی۔

یہ تو ہم نے صرف سنا ہے کہ ایک دن کسی ضرورت سے ان کی میم صاحبہ ان کے آفس پہنچ گیئں۔ انگریزی اخلاق کے مطابق یہ بڑے تپاک سے کھڑے ہو گئے بیٹھنے کو کرسی دی اور پھر بے خیالی میں کہا "مجھے لگتا ہے آپ کو کہیں دیکھا ہے؟"

ایک بار یہ بیمار اور فریش تھے، نوکر نے آن کر بتلایا کہ ڈاکٹر صاحب ان کو ملنے کے لئے آئے ہیں۔ ان کی غائب دماغی کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے نوکر کو ڈانٹ کر کہا "تجھے معلوم نہیں کہ میں بیمار ہوں ایسے میں بھلا میں کسی سے کیسے مل سکتا ہوں، جا کر کہہ دے کہ میں ملاقات نہیں کر سکتا۔"



غائب دماغی کے ساتھ ساتھ ہم نے اساتذہ کرام اور پروفیسر صاحبین کی فہم و ذکا کے نمونے بھی دیکھے ہیں۔ خود ہمارے دور میں جامعہ عثمانیہ کے انگریزی کے پروفیسر حسین علی خان کو ہم نے دیکھا کہ وقت کے بے حد پابند تھے اور طالب علموں سے بھی سختی کے ساتھ پابندی کرواتے تھے۔ سبق شروع ہو چکنے پر کوئی لڑکا پانچ منٹ بھی دیر سے آتا تو اس کو دروازہ پر ہی روک دیتے اور اپنی خاص مسکراہٹ کے ساتھ کہتے "آپ اگلی کلاس کے لئے وقت سے بہت پہلے آئے ہیں براہ مہربانی باہر ہی انتظار کیجئے"۔

دوسرے پروفیسر ویرابھدرڈو جسامت کے اعتبار سے نہایت ہی منحنی اور لاغر تھے شاید ۹۰ پونڈ سے بھی وزن میں کم لیکن انتہائی لائق اور شکسپیر کے ڈراموں پر حاوی تھے۔ ایک بار ہم لوگوں نے طلباء اور اساتذہ کی فٹبال ٹیمیں بنائیں اور اساتذہ میں پروفیسر ویرابھدرڈو کا نام بحیثیت کپتان رکھا اور نوٹس گشت کروائی۔ جب یہ پروفیسر صاحب کے پاس پہنچی تو انہوں نے لکھا "کیا آپ

لوگ ایسے پروفیسروں کو کھیل سے معاف نہ کرینگے کہ جو خود
سے بھی زیادہ ہلکے پھلکے ہیں"۔ اور اپنی گلو خلاصی کرلی۔



حاضر دماغی کے ساتھ حاضر جوابی زندگی کے حسن کو دوبالا کر دیتی ہے اور مشکل لمحوں میں زبردست ہتھیار کا کام دیتی ہے۔

سڑک چھاپ دل پھینک نوجوان نے ایک خوبصورت سی لڑکی کو تاکا اور اس کے پیچھے ہو لئے۔ اُس لڑکی نے ان کے تعاقب سے تنگ آکر پوچھا کہ وہ کیوں اس کا پیچھا کر رہا ہے۔ اُس نے جواب دیا "آپ بڑی حسین ہیں اور مجھے آپ سے ایک ہی نظر میں پیار ہو گیا ہے۔" لڑکی نے کہا "ذرا پیچھے دیکھو میری چھوٹی بہن آرہی ہے وہ مجھ سے کہیں زیادہ حسین ہے۔" یہ صاحب ٹھہر گئے اور کچھ انتظار کے بعد جب وہ دوسری لڑکی آئی تو دیکھا وہ کچھ زیادہ ہی عمر رسیدہ ہے بڑی حد تک بدشکل۔ مایوس ہو کر یہ پھر آگے گئے اور پہلی لڑکی کو جالیا۔ بڑے غصہ سے کہا "تم بڑی جھوٹی ہو۔ وہ عورت تو بدشکل ہے۔"

لڑکی نے جواب دیا "میں نے تو جھوٹ بولا ہی تھا آپ کون سے سچے ہیں۔ کہا تھا کہ مجھ سے پیار ہو گیا اور پھر فوراً ہی کسی دوسری لڑکی کی تلاش میں نکل گئے۔ کدھر گیا تھا آپ کا پیار؟"

ایک بہت بڑی دعوت میں ایک نوجوان فوجی افسر ایک خاتون سے باتوں باتوں میں کہنے لگے "وہ دیکھئے وہ جو بڑی مونچھوں والے بریگیڈیر صاحب ہیں اُن سے بُرا افسر ساری فوج میں نہ ہوگا۔ بداخلاق بدکلام اور ظالم"۔

اُس خاتون نے پوچھا "تم جانتے ہو میں کون ہوں؟ میں اُسی افسر کی بیوی ہوں"۔ اس پر نوجوان افسر نے پوچھا "خاتونِ محترم آپ جانتی ہیں میں کون ہوں؟" اُس خاتون نے انکار میں سر ہلا دیا۔ اور یہ اطمینان کا سانس لے کر اُس محفل سے فوراً رفوچکر ہو گئے۔

اسی طرح کی ایک اور محفل کا واقعہ ہے کہ نئے نئے تعارف کے بعد ہی سلسلۂ گفتگو جاری رکھنے کیلئے دُور بیٹھے ہوئے ایک شخص کی طرف اشارہ کرکے خاتون نے کہا "وہ جو صاحب صوفہ پر تشریف فرما ہیں اُن جیسا بدشکل بدہیئت آدمی میں نے نہیں دیکھا" اُن صاحب نے کہا "جی۔ وہ۔ وہ تو میرے بھائی ہیں"

اس انکشاف پر جھینپ کر خاتون نے کہا "میں بے حد معافی چاہتی ہوں۔ میں نے اس مشابہت پر غور نہیں کیا!"

کسی نودولتیے کے لئے اعلیٰ سوسائٹی کی ڈنر پارٹیوں میں جانا ضروری ہوگیا۔ قبل از قبل تہذیب و اخلاق کی باتیں سیکھنا چاہتے تھے، اپنے دوست سے پوچھا کہ اجنبیوں سے سلسلۂ گفتگو کس

طرح شروع کرنا چاہیے۔ دوست نے کہا" اور کوئی موضوع سمجھ میں نہ آئے تو چھیڑ کر یہی پوچھ لیجئے کہ آپ شادی شدہ ہیں، بچے کتنے ہیں، اس کے بعد بات پر بات نکل چلے گی اور آپ کو سلسلۂ کلام جاری رکھنے میں کوئی دقت نہ ہوگی۔"

پہلی محفل میں انہوں نے بازو بیٹھی ہوئی خاتون سے پوچھا: آپ شادی شدہ ہیں؟" خاتون نے کہا "جی نہیں"۔ اسپر یہ جھٹ سے پوچھ بیٹھے آپ کے لڑکے لڑکیاں کتنے ہیں؟" اس خاتون نے ان کو خوب ڈانٹا ڈپٹا اور یہ بہت شرمسار ہوئے۔

دوسری محفل میں انہوں نے مناسب یہ سمجھا کہ پہلے یہ پوچھ لیا جائے کہ آپ کے کوئی اولاد ہے۔ چنانچہ یہی سوال کرنے پر خاتون نے بتایا "جی ہاں! میری دو لڑکیاں اور ایک لڑکا ہے"۔ اسپر یہ اپنے سیکھے ہوئے سبق کی بنا، پر پوچھ بیٹھے "آپ کی شادی بھی ہوئی ہے کہ نہیں"۔



حاضر جوابی مزاح کا ایک بڑا اہم جزہے اور لطیفہ بنجی میں
بڑا مزہ پیدا ہو جاتا ہے اس سے وہ دوسروں کو لاجواب بھی کر دیتا ہے
اور اپنا سر اونچا بھی رکھ سکتا ہے۔

ایک بہت ہی تنگ پل پر دو موٹروں کا آمنا سامنا ہو گیا
اور موقعہ کی نزاکت ایسی تھی کہ کسی ایک موٹر کے واپس جائے بغیر دوسری
موٹر کو راستہ نہیں مل سکتا تھا۔ دونوں موٹر چلانے والوں نے زور زور
سے ہارن بجائے لیکن دونوں میں سے کوئی بھی واپس جانے کے موڈ
میں نہیں تھا، پھر اس لئے تکرار بھی ہونے لگی۔ اس پر ایک موٹر والے نے
بڑے طیش میں چلا کر کہا "میں تو کسی بے وقوف اور بے ہودہ آدمی
کو راستہ دینے کے لئے تیار نہیں ہوں۔" اس پر دوسرے صاحب نے نہایت
متانت اور وقار سے کہا "جی میں تو ایسے لوگوں کو فوراً راستہ دیدیتا ہوں"
یہ کہہ کر انہوں نے اپنی موٹر کار کو فوراً پیچھے ہٹا لیا۔

ایک اور قصہ ہے کہ کسی کے گھر ملنے والی خاتون آئی ہوئی
تھیں اور ملاقات کے کمرہ میں گھر کی بیگم اُن سے باتوں میں مشغول تھیں بہت
ہی طویل مدت کے بعد صاحب خانہ جو کہیں دور بیٹھے تھے یہ سمجھ کر کہ مہمان

خاتون جا چکی ہیں دور ہی سے چلّا کر پوچھا "کیا وہ باتونی اور بور کرنے والی عورت جا چکی؟" اب بیگم کے لئے یہ بڑا نازک موقع تھا لیکن اُس نے اپنی حاضر جوابی سے موقعہ کو سنبھال لیا یہ جواب دے کر:

"ہاں جی وہ تو کبھی کی جا چکیں اب تو بیگم انیس تشریف فرما ہیں"۔

نظام سابع اپنی سادہ زندگی کے لئے مشہور تھے۔ اکثر پھٹے پرانے کپڑے خود پہن لیا کرتے اور دوسروں کو بھی عنایت کرتے ایک روز انہوں نے اپنے توشک خانے میں سے اپنی نوجوانی کی ایک پرانی مگر بڑھیا شیروانی اپنے چھوٹے شہزادے کے لئے عید کے موقع پر پہننے کے لئے بھجوا دی۔ لیکن جب عید کا یوم سعید آیا۔ تو انہیں یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ شہزادے وہ شیروانی نہیں پہنے ہوئے تھے۔ نظامِ سابع نے خفا ہو کر اسی وقت شہزادے سے جواب طلب کیا۔

شہزادے نے کہا "میں ایسے مبارک موقع پر پرانے کپڑے نہیں پہنتا" نظام نے طیش میں کہا "جب میں حاکمِ وقت اور فرمانروا ہو کر پہن سکتا ہوں تو پھر تمہیں پہننے میں کیا اعتراض ہے؟"

"میں کیوں پہنوں" شہزادے نے قدم بوسی کرتے ہوئے جواب دیا "میرے سر پر ابھی میرے والدِ بزرگوار کا سایہ قائم و دائم ہے۔ آپ البتّہ پہن سکتے ہیں"۔

وہ قصّہ تو مشہور ہے ہی کہ سرسیّد احمد خاں علی گڑھ مسلم کالج کی تعمیر

کے سلسلہ میں چندہ جمع کر رہے تھے تو لکھنؤ کی طوائفوں نے بھی گراں مایہ رقم ان کو دینا چاہا۔ بہت سارے لوگوں نے اعتراض کیا کہ یہ حلال کی کمائی کا روپیہ نہیں اس لیئے اس کو قبول نہیں کرنا چاہئیے۔ سرسید کو دکھ ہو رہا تھا کہ آئی ہوئی رقم ہاتھ سے نکل جائے گی بالآخر انہوں نے اعلان کیا کہ وہ رقم قبول کر لی جائے گی لیکن اسکو مسلم کالج کے دارالاقامہ کے بیت الخلاء کی تعمیر میں استعمال کیا جائیگا۔ یہ ایسا تصفیہ تھا کہ اسپر مزید بحث مباحثہ کی گنجائش ہی نہ تھی۔

اسی طرح کا ایک واقعہ زمانۂ حال کا ہے کہ کسی شہر میں ہسپتال کی تعمیر کے لیئے بازاری عورتوں نے چندہ دینا چاہا تو بیش تر معززین شہر نے اسی قسم کا اعتراض اٹھایا۔ اس پر دوسرے گروپ نے بڑی شدومد کے ساتھ کہا "کیا حرج ہے اس روپیہ کو قبول کر لینے میں آخر یہ انہیں معززین شہر ہی کا تو روپیہ ہے جو ان عورتوں کے بٹوہ سے باہر آرہا ہے۔"

ایک بار دو معزز آدمیوں میں کسی بات پر جھگڑا ہو گیا۔ بات بڑھ گئی اور ایک دوسرے کو برا بھلا کہنے کی نوبت آگئی۔ ایک صاحب نے کہا "میں تو آپ کو بڑا بھلا مانس اور معقول آدمی سمجھتا تھا۔" دوسرے نے بھی تائید کی اور طنز بھرے انداز میں کہا "میرا بھی یہی خیال تھا کہ آپ بڑے شریف آدمی ہیں" اسپر پہلے صاحب

نے کہا "آپ کا خیال ٹھیک تھا غلط فہمی مجھ ہی کو ہوئی۔

کسی بھیک منگے فقیر سے تنگ آکر مالک مکان نے کہا "ہمارے گھر پر اس طرح بھیک مانگتے شرم نہیں آتی؟"

فقیر نے برجستہ کہا "آپ فکر نہ کریں میں نے اس سے بھی زیادہ گندے اور شرمناک گھر دیکھے ہیں۔"



بالعموم فلموں میں نوکر کا کیرکٹر مزاح اور نداق پیدا کرتا ہے لیکن یہ مضحکہ خیز حرکتوں اور نقالی کا معجونِ مرکب ہوتا ہے یا پھر صوبائی اور لسانی خصوصیتوں کا سہارا لیا جاتا ہے، جیسے کہ مدراسی کے لب و لہجہ کی نقل۔

وہ تو آپ نے سنا ہی ہوگا کہ ایک صاحب نے اپنے نوکر کو بڑی مشکلوں سے یہ تربیت دی تھی کہ جب وہ کوئی چیز مانگیں نوکر اس کو کشتی میں رکھ کر پیش کیا کرے۔ انھوں نے ایک دن اپنے جوتے مانگے تو وہ بھی اسی طرح کشتی میں پیش کئے گئے۔ ایک اور صاحب نے اپنی امارت کا رعب قائم رکھنے کے لئے اپنے نوکر کو سکھا کر رکھا تھا کہ جب کبھی وہ اپنے مہمانوں کے سامنے کسی چیز کے حاضر کرنے کا حکم دیں تو نوکر ہمیشہ اس بات کی وضاحت چاہے کہ وہ کس نوعیت اور کس قسم کی چیز مانگ رہے ہیں مثلاً وہ حکم دیں کہ مہمان کے لئے شربت لائے تو چاہے گھر میں ایک ہی قسم کا شربت میسّر ہو لیکن وہ ضرور پوچھ لے "سرکار خس کا شربت گلاب کا شربت، سنگترے کا، بادام کا کون سا شربت پیش کروں؟" ظاہر ہے وہ حکم تو اسی چیز کا دیں گے جو گھر پر موجود ہو۔ کبھی یہ کہیں

کہ پان حاضر کرے تو نوکر ضرور استفسار کرتا کہ بانگلہ۔ لکھنئی۔ بنارسی سادہ۔ مسالہ دار کون سا پان پیش کروں اور ان کا جواب اسی حد تک محدود ہوتا کہ جو پان گھر میں مہیا ہے۔

ایک دن اتفاق سے انہیں یاد آیا اُن کے والد بزرگوار کی جو تلوار رکھی ہے وہ اپنے مہمان کو دکھائی جائے اور نوکر کو آواز دی کہ والد مرحوم کی تلوار لے آئے۔ اب ان کی تربیت کے مُطابق نوکر کو پوچھنا تو یہ چاہئیے تھا کہ دو دھاری تلوار لاؤں کہ اصفہانی لاؤں کہ مرصع لاؤں! لیکن نوکر نے اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق یہ پوچھ لیا " سرکار آپ کے کون سے والد کی تلوار لاؤں! بیجاپور کے والد کی کہ نل گنڈے کے کہ چمر باڑے کے؟"

جن دنوں چین نے ہندستان پر حملہ کیا تھا۔ اُن دنوں کا واقعہ ہے کہ حیدر آباد کے ایک رئیس گھرانے کے نوکر وہاں سے رخصت ہوکر کسی دوسرے گھر میں نوکری کی غرض سے پہنچے۔ وہاں جب ان سے پوچھا گیا کہ انہیں پچھلی نوکری کس وجہ سے چھوڑنی پڑی۔ بولے:
" ہم تے کام تو ایسا کیا تھا کہ اسپر ہمیں انعام ملتا۔ الٹا ہم نکل لے گئے"
صاحبِ خانہ نے پوچھا " تم نے وہاں ایسا کیا کام کیا تھا"
بولے " ہم نے چینی کے سارے برتن توڑ دیئے تھے "
" مگر تم نے چینی کے سارے برتن کیوں توڑے؟ "

"سرکار جب چین نے اپنے دیس پر حملہ کیا ہے تو پھر ہم اپنے گھر میں چین کے برتن کیسے رکھ سکتے ہیں — میں نے تو اب دل میں یہ ٹھانی ہے کہ خود لڑائی کے محاذ پر جا کر چینیوں سے جنگ کروں گا۔"

صاحب خانہ نے مسکرا کر پوچھا "جنگ کروگے؟ مگر تم جنگ کے بارے میں کیا جانتے ہو۔"؟

"جنگ کے بارے میں جتنا میں جانتا ہوں اُتنا دُوسرا کوئی نہ جانتا ہوگا۔" نوکر نے جواب دیا۔ "میں مہدی نواز جنگ، رستم یار جنگ افسر بہادر جنگ کی نوکریاں کر چکا ہوں"!

ایک مہمان مدتوں ڈٹے رہے۔ میزبان نے اُن کو ٹالنے کیلئے اشارۃً کہا کہ آپ کے بیوی بچے یاد کرتے ہوں گے۔ یہ فوراً بولے کہ آپ کہیئے تو اُنہیں بھی بلا لوں۔ میزبان اس مصیبت سے تو جوں توں بچ گئے اور میزبانی جھیلتے بھگتے رہے۔ بالآخر وہ دن آیا کہ یہ جانے کو تیار ہو گئے۔ وقت سے بہت پہلے ہی اُن کو اسٹیشن بھجوانے کا انتظام کیا گیا لیکن پھر بھی احتیاطاً ڈرائیور کو تاکید کر دی گئی کہ بہر صورت گاڑی پر پہنچا دینا خبردار جو کسی وجہ سے مہمان کو واپس لایا۔

شاید بیوی بچوں کی یاد نے زور کیا تو راستہ میں یہ مہمان ڈرائیور سے کہنے لگے کہ تیز چلو ورنہ گاڑی چھوٹ جائے گی۔

ڈرائیور نے جواب دیا کہ صاحب آپ بے فکر رہیں میں تو آپ

کو ضرور پہنچادوں گا۔ اور جو خدانخواستہ آپ کی گاڑی چھوٹی تو سمجھئے کہ میری نوکری بھی چھوٹی۔

مسز جے پال نے روتے روتے اپنی خادمہ سے کہا "میرے شوہر آج کل اپنے آفس کی ایک ٹائپسٹ سے عشق لڑا رہے ہیں" خادمہ نے کہا "مالکن میں بالکل یقین نہیں کرتی۔ یہ تو آپ صرف مجھے رشک و حسد سے جلانے کیلئے ایسا کہہ رہی ہیں۔"

ایک بار ہمارے ایک ماتحت عہدہ دار مٹھائی کی ٹوکری لئے آئے اور کہا "حضور والا میری بیوی کو خدا کے فضل و کرم اور آپ کی مہربانی سے لڑکا ہوا ہے۔"

ہم آج تک حیران ہیں کہ اس میں ہماری کونسی مہربانی کا دخل ہے اور ان سے بہت حجت بھی کی کہ بھئی یہ تو محض اللہ تعالی کی مہربانی ہے مگر وہ مصر ہیں کہ ہم کو بھی اس فضیلت میں شریک رکھیں۔

خادمہ کو نوکری سے علیحدہ کرتے ہوئے مالکن نے بہت سخت سست کہا۔ انتظامی صلاحیتوں کے سوا پکوان سے عدم واقفیت کا بھی طعنہ دیا۔ اسپر خادمہ بڑی چراغ پا ہوئی اور جواباً کہا:

"صاحب خانہ تو میرے پکوان اور امور خانہ داری سے بہت خوش تھے۔ انہوں نے خود یہ کہا کہ میرا پکوان آپ سے کہیں زیادہ ذائقہ دار ہے۔" مالکن نے سنی ان سنی کی اور خاموشی میں جھلائی

سمجھی۔ خادمہ کہاں چپ رہنے والی تھی وہ اپنی بڑ ہانکتی رہی۔
" اور پھر میں تو بستر پر بھی آپ سے زیادہ ہی لطف اور مزہ دے سکتی ہوں"۔

بے چاری مالکن نے جل بھن کر طنزاً پوچھا:
"کیا یہ بھی میرے شوہر نے تم سے کہا ہے؟"
"جی نہیں۔ محترم خاتون۔ یہ بات تو آپ کے موٹر ڈرائیور رتے بتاتی ہے۔" خادمہ نے جواب دیا۔

نبی آیا سے لڑکا دور دور اور کھچا کھچا تھا۔ ماں نے کہا:
"جاؤ بیٹا آیا سے شرماؤ نہیں اسکی گود میں بیٹھ کر اس کو پیار کرو"۔

صاحبزادے نے کہا" نہیں ممی! میں پیار تو نہیں کر دں گا۔ اس نے ابھی ابھی تو ڈیڈی کو اسی بات پر زور کا طمانچہ مارا ہے"۔



بالعموم اہلِ زندگی کے بہت ہی معمولی واقعات اپنی ندرت کی وجہ سے عمر تمام دماغ پر چھائے رہتے ہیں اور ان حسین لمحات کی یاد کو تازہ رکھتے ہیں کہ جو ہر کسی کو جوان رکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

میرے ایک بہت ہی عزیز اور مخلص دوست ہیں مہدی علی ان کے علاوہ ان کے دو بڑے بھائی سول سروس کے ممتاز افراد تھے اور ان کو اس پر بجا ناز تھا۔ ہمیشہ اُن کے گن گایا کرتے۔ ان دونوں کی شکل و صورت رہن سہن ذوق و شوق علمی و ادبی کارنامے غرض کہ ہر چیز قابلِ تعریف تھی ان کی نظر میں۔ ایک دن یہ از خود ان دونوں کا مقابلہ کرتے کرتے بڑی معصومیت سے کہہ گئے "دونوں میں چھوٹے بھائی بہت زیادہ خوبرو اور عقل مند ہیں سب کا خیال ہے میں ہر لحاظ سے ہو بہو انہیں جیسا ہوں"۔

سیول سروسیز ہاؤز کے عشائیہ کے بعد ہمارے انگریز مودب کسی کام سے اٹھ کر باہر گئے اور اُن کی انگریز میم صاحبہ نے کچھ کہنے کی خاطر پکارا "ڈرالنگ سنئے تو" وقت کی بات کہ آواز ہمارے دوست کے کان میں پڑی اور ایسی کہ وہ سمجھے ان کا نام لے کر پکارا اور متوجہ کیا۔ یہ ٹھہرے اخلاق و آداب کے مجسمہ تڑپ کر اٹھے اور پوچھا:

"جی آپ نے مجھے پکارا" ! اور جو دوسروں نے پوری بات سنی

ہوئی تھی اُن کے لئے یہ بات دیوارِ قہقہہ بن گئی اور برسوں اُس کا نہ صرف تذکرہ رہا بلکہ عملی مظاہرہ بھی ہوا کیا۔ ان دنوں کی یادان کا دہرانا از خود پُر لطف لطیفے ہیں۔



آج کل کے مشینی دور میں ہمہ جہتی ترقی کے راستے اتنے کھل گئے ہیں کہ کمپیوٹر مشین کا زمانہ کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔ ہر قسم کی معلومات اور متعلقہ مواد مشین کے اندر ڈال دیا جائے تو صحیح جواب نکل آتا ہے چنانچہ لڑکے لڑکی کی ساری تفصیلات اس مشین میں ڈال دیجئے اور یہ حتمی طور پر معلوم کر لیجئے کہ دونوں شادی کیلئے موزوں ہیں کہ نہیں۔ پہلے جو بات جوتش اور رمل سے نکالی جاتی تھی وہ اب مشین سے معلوم ہونے لگی۔

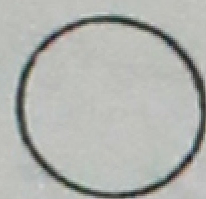
خیال تو یہ ہے کہ اب ڈاکٹر بھی اسی مشین سے کام لیا کرینگے بیماری کی ساری علامتیں اور تفصیلات اس میں ڈال دیں اور دوا کا صحیح نسخہ نکل آئیگا۔

کسی صاحب کو ان باتوں پر اعتبار نہ آتا تھا انہوں نے آزمانے کے لئے کہا اس مشین سے معلوم کیجئے کہ میرے والد مسٹر جانسن اس وقت کہاں ہیں۔ چنانچہ مشین کے بہت سارے کھٹکے دبائے گئے اور جواب نکلا "آپ کے والد اس وقت ڈبرہ دون میں گالف کھیل رہے ہیں"۔ اس پر یہ بہت ہنسے اور کہا "میری بات کی تصدیق ہو گئی کہ

یہ مشین سچ بات بتلانے سے قاصر ہے، میرے والد اس وقت یہیں بمبئی میں اپنے ورلی آفس میں بیٹھے کام کر رہے ہیں۔" مشین کی بتائی ہوئی بات کو آزمانا تھا پھر ایکبار ساری معلومات بھری گئیں۔ اب کے جواب ملا۔ "جی ہاں بے شک مسٹر جانسن اس وقت اپنے ورلی کے آفس میں بیٹھے کام کر رہے ہیں لیکن آپ کے والد تو ڈیرہ دون میں گالف کھیل رہے ہیں۔"

ریلوے اسٹیشن پر لگی ہوئی اس قسم کی مشین پر ایک صاحب کھڑے وقت گذاری کیلئے سوال جواب کر رہے تھے۔ مختلف سوالوں کے جواب میں ان کو معقول اور تشفی بخش باتیں معلوم ہوتی رہیں حتیٰ کہ ایک کارڈ پر لکھا ہوا ملا۔

"اے احمق انسان تیری ٹرین کو گئے ہوئے عرصہ ہو گیا اور تو یہیں کھڑا ہے۔"



مُلّا نصیر الدّین کے قصّے بھی بڑے مزہ دار ہیں۔ اُن کی ایک واحد شخصیت ایسی ہے کہ جس نے ترکی کو مزاح و لطافت کے میدان میں نمایاں اور اہم جگہ پر کھڑا کر دیا ہے۔

کہتے ہیں کہ ایکبار یہ اپنے پڑوسی سے پکوان کا ایک برتن مانگ کر لے آئے۔ کئی دن کے بعد اس برتن کے ساتھ ایک چھوٹا سا اسی قسم کا ایک اور برتن پڑوسی کے پاس لے گئے اور اُسکے خود کے برتن کے ساتھ یہ بھی اسکو دے دیا۔ پڑوسی نے کہا "بڑا برتن تو میرا ہے لیکن یہ چھوٹا برتن کیسا"؟ ملّا نصیر الدین نے جواب دیا "بھئی تمہارے برتن کے یہ بچّہ ہوا ہے اس لئے وہ بھی تمہارا ہی ہوا اسلئے میں دونوں تم ہی کو دے رہا ہوں"۔ پڑوسی نے بھی سمجھا کہ بڑے بے وقوف سے پالا پڑا ہے چلو یہی سہی' اُن کی بات منظور کر کے دونوں برتن رکھ لیئے۔ بہت دِنوں بعد جب یہ بات رفت گذشت ہو گئی تو ملّا نصیر الدّین پھر اپنے پڑوسی کے پاس پہنچے اور اس سے یہ کہہ کر کہ دو سو مہمانوں کی دعوت ہے اسکے لیئے بڑے سے بڑا پکوان کا برتن چاہیئے۔ پڑوسی سے بہت ہی بڑا بھگونا لے گئے۔ ایک عرصہ دراز تک انتظار کر کے پڑوسی نے یاد دلایا کہ اُسکا

بچھونا واپس نہیں ہوا۔ مُلّا صاحب نے بڑے افسوس کا اظہار کیا۔ اور یہ غمناک خبر سُنائی کہ وہ بچھونا تو مر گیا۔ پڑوسی نے کہا کہ بھلا ایسے کہیں ہو بھی سکتا ہے کہ برتن مرجائے۔ اس پر ملا صاحب نے کہا کہ بھائی جب برتن کے بچّہ پیدا ہو سکتا ہے تو کیا وہ مر نہیں سکتا!

ایک بار مُلّا نصیر الدّین سڑک پر روشنی کے لمپ کے نیچے کھڑے کچھ ڈھونڈ رہے تھے کچھ لوگ جمع ہو گئے اور استفسار کیا کہ کیا ڈھونڈ رہے ہیں؟ انہوں نے بتایا کہ کچھ اشرفی کے سکے گر گئے ہیں اور وہ ڈھونڈ رہے ہیں۔ لوگوں نے مدد کرنے کی نیت سے پوچھا کہ "بھئی بتاؤ تو کدھر گرے؟" انہوں نے دور ایک طرف اندھیرے میں بتا کر کہا "اُدھر" حیرت سے لوگوں نے کہا اگر اُدھر اشرفیاں گری ہیں تو یہ ان کو ادھر کیوں ڈھونڈ رہے ہیں۔ انہوں نے جواب دیا "بھئی اُدھر اندھیرا ہے۔ اسی لئے یہاں اجالے میں ڈھونڈ رہا ہوں۔"

ایک بار مُلّا سو رہے تھے کہ مکان میں کھٹ پٹ کی آواز آئی کسی نے کہا کہ چور گھس آئے ہیں۔ یہ سُننا تھا کہ مُلّا نصیر الدّین بھاگ کر بستروں کے ڈھیر میں چھپ گئے۔ چوروں کو کچھ نہیں ملا اور خالی ہاتھ چلے گئے تو انہوں نے کہا کہ میں نے اسی لئے شرم کے مارے مُنہ چھپا لیا کہ چور کیا سمجھیں گے کہ اس بدبخت کے گھر کچھ بھی نہیں۔

مُلّا نصیر الدّین ایک بار کسی محفل میں تقریر کرنے کھڑے

ہوئے اور تقریر کرنے سے پہلے سوال کیا "صاحبان آپ کو معلوم ہے کہ میں کیا کہنے والا ہوں؟" لوگوں نے کہا "نہیں ہم نہیں جانتے۔" تو یہ جھٹ سے شہ نشین سے اتر آئے کہ ایسے جاہلوں سے انہیں پھر تو کچھ کہنا ہی نہیں۔ کچھ عرصہ بعد پھر ایسا ہی اتفاق ہوا کہ یہ تقریر کرنے پہنچے اور وہی سوال دہرایا لوگوں نے سوچا اب کی بار الٹا ہی جواب دینا چاہیئے۔

سبھوں نے چلا کر کہا "ہاں ہم جانتے ہیں کہ آپ کیا کہنے والے ہیں"۔ اسپر بھی یہ شہ نشین سے اتر آئے اور کہا کہ "جب آپکو معلوم ہی ہے تو پھر میں کیوں اپنا وقت خراب کروں۔" یہ بات بھی رفت گزشت ہو گئی اور ایک مدت کے بعد ایسا ہی کچھ موقعہ آیا لوگوں کو مخاطب کرنے کا۔ اور انہوں نے ایک بار پھر مجمع سے وہی سوال دہرایا۔ لوگ اس بار ہوشیار ہو چکے تھے۔ مجمع میں سے کچھ نے کہا "ہاں ہم جانتے ہیں" اور کچھ نے کہا "نہیں ہم نہیں جانتے۔" اسپر ملا نصیرالدین نے ایکبار پھر اپنا بھرپور وار کیا اور یہ کہہ کر وہاں سے نکل گئے "جو حضرات کو معلوم ہے کہ میں کیا کہنے والا ہوں وہ براہ کرم ان تمام لوگوں کو کہ جنہیں نہیں معلوم ہے سب کچھ بتا دیں۔" اور پھر شہ نشین سے اتر کر چلے گئے۔



زبان کے لطیفے بڑے مزہ دار ہوتے ہیں۔ جیسے زیادہ سے زیادہ ہندی بولنے کے شوق میں ایک نوآموز ہندی داں نے ایک سبھا میں دیر سے پہنچنے کی معافی اس طرح پر چاہی:

"دیویو تتھا سجنو! شما کیجئے کہ آپ کے کریا کرم (کاریہ کرم) میں آتے آتے دیر ہو گئی۔"

اسی طرح ایک ٹھیٹھ ہندی بولنے والے سجن حیدر آباد آئے تو کسی سے پوچھا "سنا ہے کہ یہاں پر پردشنی (نمائش) بڑی اچھی ہے؟" اب یہ حیدر آبادی پردشنی سے ناآشنا تھے سمجھا کہ کسی گانے والی عورت کو پوچھ رہے ہیں کہا کہ "پردشنی تو میں نہیں جانتا البتہ رنجنی بڑی اچھی گائک گلا کارہے۔"

ایک بار ہمارے ایک بڑے حاکم ریل سے کہیں جارہے تھے اور ان کی ٹرین ہمارے مستقر کے اسٹیشن پر سے گزرنے والی تھی میں چونکہ مستقر سے باہر تھا اپنے مددگار کو ہدایت دیدی کہ وہ اسٹیشن پر اُن سے ملے کچھ پھولوں کے ہار اُن کی خدمت میں پیش کردے اور ہمارا سلام پہنچادے۔ مستقر پر واپسی پر مددگار نے بڑے جوش سے

بتایا" صاحب وہ حاکم ۲۷ر تاریخ کو گذر گئے۔ ہیں نے پھول چڑھا دیئے اور سلام پڑھ دیا۔"

مقامی بول چال کے تعلق سے اکثر ایک چاشنی پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک لکھنوی صاحب حیدر آباد پہنچے اور سالار جنگ میوزیم کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے کسی سے پوچھا "کیا سالار جنگ میوزیم یہی ہے؟" روز مرّہ کی ٹھیٹھ دکھنی زبان میں ان کو جواب ملا "ہَو"۔ یہ کچھ نا بلد تھے۔ اس جواب سے تشفی نہ ہوئی تو دو ایک اور لوگوں سے بھی یہی سوال کیا۔ ہر بار یہی جواب ملا "ہَو"۔ کچھ دیر بعد مزید استفسار پر ایک صاحب نے جواب دیا "جی ہاں! سالار جنگ میوزیم یہی ہے"۔

اس جواب سے بڑے خوش ہو کر لکھنوی صاحب نے سارا قصّہ بتایا کہ کئی لوگوں نے کس طرح ان کے سوال کا جواب دیا۔ اس پر انہوں نے کہا "ہاں صاحب۔ یہاں پر اکثر و بیشتر ان پڑھ اور جاہل عوام الناس اسی طرح "ہو" اور "نکو" کہہ کر بات کرتے ہیں۔" اس پر لکھنوی صاحب نے کہا کہ "آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ آپ تو پڑھے لکھے ہیں نا؟" اس پر انہیں پھر جواب ملا۔ "ہَو!"۔

اب آپ بمبئی کی زبان کی کرشمہ سازی بھی سُن لیجئے۔ بمبیا زبان میں روزمرّا کی گفتگو میں لفظ "سالا" بہت اور بے محابا استعمال ہوتا ہے۔ ایک دفعہ کسی باہر سے آنے والے کا تعارف میزبان نے جملہ

حاضرینِ محفل سے کرادیا لیکن ایک بزرگ صورت کسی کونے میں الگ تھلگ بیٹھے تھے، اُن سے تعارف نہیں ہوا تو مہمان نے الگ تھلگ بیٹھے ہوئے صاحب کی طرف اشارہ کرکے دریافت کیا کہ "ان صاحب کی تعریف؟" میزبان نے کہا "ارے یہ سالا تو میرا باپ ہے اِس کی تعریف کچھ نہیں"۔

اسی طرح کسی بمبئی والے سے پوچھا گیا "جناب آپ کا دولت خانہ کہاں ہے؟" جواب ملا کہ "صاحب ہم تو اپنی ساری دولت بنک میں رکھتے ہیں۔ ہمارا کوئی الگ خانہ نہیں"۔

بہت دنوں کی بات ہے میری بیوی اپنی بہن کے ساتھ حیدرآباد سے کچھ خریداری کے سلسلے میں بمبئی آئیں۔ کپڑے کے مارکیٹ میں یہ گھوم پھر رہی تھیں کہ کسی دکاندار نے انہیں مخاطب کرنے کے لئے کہا:
"او موٹھی بائی ادھر آنا کپڑے کا نیا اسٹاک آیلا ہے"۔

یہ دونوں سکتہ میں آگئیں کہ ایک تو اُن کو موٹھی کہا اور پھر بائی۔ اسلئے کہ حیدرآباد میں یا شمالی ہند میں بھی کسی کو بائی کہہ دینا بڑی سے بڑی گالی کے مترادف ہے اور یہاں بمبئی میں تو تعظیم کیلئے اس سے بڑا کوئی خطاب نہیں اور موٹھی کے معنی تو بڑی کے ہیں ہی۔



بسا اوقات کسی شاعر گر کی موجودگی ایک شاعر یا بہت سارے شعراء کے فن کو چار چاند لگا دیتی ہے۔ اسی طرح ہم بھی ایک لطیفہ گر کو جانتے ہیں جنکو دنیا زیادہ تر شاعر یا سیاستداں کی حیثیت سے ہی جانتی ہے۔ وہ ہیں مخدوم محی الدین۔ کالج کی ابتدائی زندگی میں یہ صرف شاعر تھے چنانچہ دارالاقامہ فرحت منزل میں ہمارے عزیز ساتھی عبدالوہاب کے پیلے دوشالہ کے چوری جانے پر انہوں نے شاید اپنی پہلی نظم بڑے دردناک پیرایہ میں موزوں کی اس کا عنوان تھا پیلا دوشالہ اور اس دوشالہ کی کار آموزی کو بڑے ستھرے انداز میں ظاہر کیا گیا۔

اوگرم کن پہلوئے من بانہ بیائی

اور پھر ٹیپ کا بند تھا گریم ز جدائی۔ گریم ز جدائی

کون چٹ کر گیا تجھ کو اور رپٹ کر گیا مجھکو۔ گریم ز جدائی۔ گریم ز جدائی

آں روز بیاد ارہ کہ من زیر و تو بالا

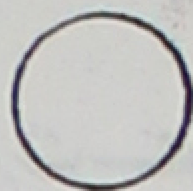
غرض کہ اس مرصع شاہکار کو پیلے کاغذ پر چھاپ کر عوام کے بے حد اصرار پر تقسیم بھی کر دیا گیا۔ جو سنتا لطف اندوز ہوتا اور ہر محفل میں اسی کے چرچے ہوا کرتے۔ اور یہ فی الحقیقت نمایاں زدِ عام ہو گئی۔

اسی درمیان میں کلیہ جامعہ عثمانیہ معہ اپنے اقامت خانوں کے اڈک میٹ منتقل ہوگیا اور اسی خوشی میں ایک بڑا بھاری جشن منعقد ہوا جہاں اور بھی دلچسپ پروگرام چلے وہاں محفل قوالی بھی سجائی گئی۔ بڑے سے اسٹیج پر قوال اور ہمنواؤں کے سوا ایک نورانی داڑھی والے بزرگ صورت اپنے معتقدین اور مریدین کے ساتھ اسٹیج پر جلوہ افروز ہوئے اور قوالی کی وہی دھن گریم زجدائی۔ گریم زجدائی گونجنے لگی۔ جیسے جیسے رنگ جمتا گیا ان بزرگ کو حال چڑھتا گیا۔ قوالوں کو داد وتحسین واہ۔ واہ۔ مرحبا۔ سبحان اللہ کے علاوہ روپے بھی دئیے جانے لگے۔ پیرومرشد کے قدموں کو چھوکر بطور نذرانہ بھی روپے وارے جاتے رہے۔ ان بزرگ کو خود بھی داد ودہش کی سوجھی تو اپنا متبرک رومال دے دیا۔ پھر اپنا عمامہ دے دیا۔

اور بھی رنگ زور پکڑا تو اپنی شیروانی بھی عطا کر دی۔ اور اب صرف کرتے پاجامے سے اسٹیج پر تشریف فرما تھے۔ جب لوگوں نے نذر سے ہاتھ روک لیا تو ان کے پاس کچھ رہا نہیں اور ادھر گریم زجدائی کلائی میکس پر تھا۔ بے ساختہ اور فی البدیہہ ان بزرگ نے اپنی نقلی داڑھی اتاری اور قوال کے نذر کردی۔ اس وقت جو قہقہے کھڑے ہوئے ہیں وہ بیان سے باہر ہے۔ یا تو ادھر سماں بندھا تھا گریم زجدائی کا یا پھر ساری محفل ہنستے ہنستے پیچ مچ لوٹ پوٹ ہوئی جا رہی تھی۔ اور

یہ بزرگ صورت تھے ہمارے دوست مخدوم محی الدین۔ جنہوں نے لطیفہ گری کے فن کی ابتدا کی لیکن بعد میں سیاست کی اُلجھنوں میں کسی اور منزل پر جا پہنچے۔

اُن کی لطیفہ گری اس زمانہ میں معراج پر تھی۔ دارالاقامہ کی شاندار اونچی عمارت کی بالائی منزل پر مودب کے کمرے میں سب جمع تھے۔ شام کا وقت تھا مودب صاحب نے کہا "صاحب یہاں سے غروب آفتاب کا بڑا دلکش نظارہ ہوتا ہے آپ لوگ کچھ دیر ٹھہر جائیے"۔ مخدوم کھسکنا چاہتے تھے معافی چاہتے ہوئے کہا "میں تو اجازت چاہونگا جلدی میں ہوں ایسا ہی ہو تو کل صبح ہی یہاں حاضر ہو جاؤنگا اور غروب آفتاب کا منظر دیکھ لونگا" ابھی ہم سوچتے ہی رہے کہ صبح کے وقت غروب آفتاب؟ اور یہ غائب ہو گئے۔ ہم سب کی ہنسی کا یہ عالم کہ رو کے نہ رکے۔ اس طرح پر ہر روز لطیفہ گری ہوا کرتی ہے۔



میرے زمانہ کے سینئر گروپ میں مخدوم میر حسن۔ نور الہدیٰ جیوت غلام علی۔ شنکر جی۔ امین مرتضیٰ۔ شہریار کاؤس جی۔ شکور بیگ ہوا کرتے اور جونیئر گروپ میں مے کش۔ عزیز الحق۔ عباس علی خاں۔ امجد ورِیندر بھارت چند کھنّہ۔ ملیا پٹیل۔ سبزواری۔ شعیب۔ اشرف غازی، کوئی موقعہ کوئی نشست کوئی محفل ایسی نہ ہوتی کہ جہاں نت نئے لطیفے جنم نہ لیتے ہوں۔ میکش کی اعلیٰ شاعری کے سوا "پرواز" کے نام سے جو اساتذہ کے خاکے چھپے ہیں اسنے تو ہنگامہ بپا کر دیا۔

اقامت خانے میں ہر کسی کی شخصیت کی موزونیت سے کمروں کے نام بھی دلچسپ ہوا کرتے۔ میکش کا مے خانہ۔ محامد علی عباسی کا کارخانہ کہ جہاں دن رات پڑھائی کی محنت ہوا کرتی عبدالوہاب سلم کا پے خانہ اور موسوی (لالو) کا نگار خانہ۔ یہ سب ہمہ وقتی لطافت و ظرافت کے اکھاڑے تھے۔

ایک بار مخدوم طویل عرصہ تک اپنے گھر سے باہر رہے۔ ایک دن کسی بڑے شہر کے ریسٹورنٹ میں صبح صبح پہنچ کر آرڈر دینے لگے "دو انڈے کچے پکے، توس جلا ہوا۔ چائے پھیکی بدمزہ۔ اور دودھ سڑا

ہوا اور اُترا ہوا جلد لے کر آؤ"

آرڈر لینے والی لڑکی نے حیرت سے پوچھا "ایسا کیوں؟"

بولے "گھر پر یہی ناشتہ کرتا ہوں" جلد لے کر آؤ

جب لڑکی دو انڈے کچے پکے، جلا ہوا توس اور ٹھنڈی بدمزہ چائے اور اترا ہوا دودھ لے کر آئی تو مخدوم نے اسے اپنے پاس بٹھا کر کہا:

"اب میری عیب جوئی شروع کرو"

"کیوں"؟ حیرت زدہ لڑکی نے پوچھا۔

"مجھے اپنی بیوی کی یاد ستا رہی ہے"۔

اِن لطیف حکایتوں کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ تازہ واقعہ سُنئے مخدوم محی الدّین کسی ہوٹل میں گئے اور قورمہ روٹی کا آرڈر دیا۔ بیرے نے بتایا کہ تیار نہیں۔ پلاؤ مانگا وہ بھی تیّار نہ تھا۔ پراٹھے قیمہ طلب کرنے پر بتایا گیا وہ بھی اسٹاک میں نہیں۔ یہ جھنجھلا کر بولے "یہ ہوٹل ہے کہ میرا گھر؟"

اسی دور کے میرے پرانے ساتھیوں میں سے ایک نورالہدیٰ صاحب تھے۔ بے حد بذلہ سنج۔ ایک بار وہ بمبئی آئے اور کسی ایرانی ہوٹل میں بیٹھ کر کھانے کا آرڈر دینے لگے۔

ہوٹل والے چھوکرے سے پوچھنے لگے "بریانی ہے"۔ ختم ہو گیا۔

"تو مٹن چاپ لاؤ"

"ختم ہو گیا"

"اچھا تو قورمہ"

"ختم ہو گیا" چھوکرے نے اسی لہجے میں جواب دیا۔

"مچھلی فرائی لاؤ"

"ختم ہو گیا" چھوکرا بولا۔

"تو مرغ تیار ہے؟"

"نہیں ختم ہو گیا"

نورالہدیٰ جھلا کر بولے "کتے کا گوشت ہے؟"

"وہ بھی ختم ہو گیا" چھوکرے نے اسی لہجے میں فوراً جواب دیا۔

کسی زمانہ میں باغ عامہ حیدرآباد کے اندر بڑا ہی عمدہ چڑیا گھر ہوا کرتا تھا جس میں بندر لنگور بن مانس اور دوسرے جانور کثیر تعداد میں تھے۔ ایک بار مجید رضوی مرحوم باغ عامہ کے دروازہ پر تھے اور دیکھا کہ ایک عجیب الخلقت اور بگڑے ہوئے حلیہ والے صاحب جلدی جلدی اندر داخل ہو رہے ہیں۔ انھوں نے ان کو روک کر کہا "مولوی صاحب، ایک معروضہ ہے آپ براہِ کرم باغ عامہ کے اندر تشریف نہ لے جائیے"۔ ان صاحب نے بگڑ کر پوچھا "میں کیوں نہ جاؤں، آپ کون ہوتے ہیں روکنے والے؟"

مجید نے بڑی سادگی سے کہا "میں نے صِرف اسلئے کہا کہ اندر دو ایک پنجرے خالی پڑے ہیں"۔



عدالت کے کمروں میں بھی لطیفوں کا فقدان نہیں۔ ایک منصف صاحب کے اجلاس پر فریق اثالثاً حاضر تھا اور مخالف کا وکیل اُس پر بری طرح چھایا ہوا تھا اور اُسکی اپنی جاہلیت نادانی اور ناتجربہ کاری کی وجہ سے سارا مقدمہ اسکے خلاف جا رہا تھا۔ منصف صاحب نے پوچھا کہ تم کوئی وکیل کیوں نہیں کر لیتے۔ فریق نے کہا "حضور وکیل کرنے کو خرچہ لگتا ہے اور میری یہ سکت نہیں اسلیے مجبور ہوں"۔ منصف صاحب نے کہا کہ وکیل کرنیکو ایسا کچھ زیادہ صرفہ نہ ہوگا کم فیس والے بھی وکیل ہیں دو چار روپیہ میں بھی کوئی نہ کوئی پیروی کر دے گا۔ اور عدالت کے چپراسی سے خود ہی کہا کہ وکلا کے کمرہ سے کسی دو چار روپیہ فیس والے وکیل کو بلا لائے۔ یہ چپراسی وکلا کے کمرہ میں جا کر بالکل اسی طرح پکار پکار کر کہنے لگا کہ منصف صاحب نے ایک مقدمہ کی پیروی کیلئے کسی دو چار روپے فیس والے وکیل کو طلب کیا ہے۔ وکیل چاہے فیس کے معاوضہ میں ایک چائے کی پیالی ہی پر اکتفا کر لے لیکن اس قسم کی تذلیل برداشت نہ کر سکے گا۔ سبھوں نے یک زبان ہو کر کہا "جاؤ منصف صاحب سے کہہ دو کہ اب ایسا کوئی وکیل یہاں پر نہیں ہے۔ جو اس شہر کے وکیل تھے

وہ سب منصف بن چکے ہیں۔

ایک مقدمہ میں گواہ پر جرح ہو رہی تھی۔ مخالف فریق کے وکیل نے اس گواہ کے خلاف فضا پیدا کرنے کیلئے ہاں یا نہیں کے جوابات پر اصرار کرتے ہوئے پوچھا "مسٹر رضوی آپکے ساتھ کوئی خاتون رہتی ہیں جنکو مسز رضوی کہا جاتا ہے۔ جواب "ہاں"

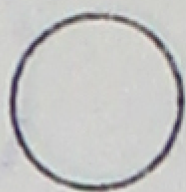
"کیا اُن کا سارا خرچہ آپ خود اٹھاتے ہیں؟" جواب "ہاں"

"کیا آپ کی یہ بیاہتا بیوی ہیں؟" جواب "نہیں"

"مجھے اس سے زیادہ اور کچھ جرح کرنا نہیں"۔ جیوری کے سامنے مسٹر رضوی کے کردار کو بہت بڑا دھکا لگا حالانکہ واقعہ یہ تھا کہ مسز رضوی رضوی صاحب کی والدہ تھیں۔

عدالت سے مقدمہ جیتنے پر وکیل صاحب نے اپنے موکل کو تار کیا "سچ کی جیت ہوئی آگے کیا کیا جائے"

ان کو جواب ملا "فوراً ہی مرافعہ (اپیل) دائر کر دیا جائے" موکل نے سمجھا اپنا مقدمہ تو جھوٹا ہے سچ کی جیت ہوئی ہو تو اسکے اپنے خلاف ہی جائیگی اسلئے مرافعہ کی ضرورت محسوس کی"۔



آج کل کی مزدور تحریک میں ہر قسم کی ہڑتالیں آئے دن ہوتی رہتی ہیں۔ کسی کارخانہ میں "بیٹھے رہو ہڑتال" کے موقعہ پر کارخانہ دار نے کسی قسم کی مزاحمت نہ کی صرف اتنا ہی کیا کہ کارخانے کے اندر باہر کے جتنے بیت الخلاء اور پیشاب خانے تھے سب پر تالے لگا دیئے۔ ظاہر ہے کہ ضروریات سے فارغ ہونے کے لئے ان کو باہر جانا ہی پڑا اور ہڑتال موثر نہ ہو سکی۔

ایک اور جگہ اس قسم کی ہڑتال کے شروع ہوتے ہی تمام ہڑتال کرنے والوں کو آرام دہ بستر مہیا کر دیئے گئے۔ مشروبات کے ساتھ ساتھ شراب بھی دی جانے لگی اور جب مزدوروں کا سرور بڑھا تو کچھ خوبصورت لڑکیاں بھی موجود ہو گئی ہیں جو ساقی کا کام کرنے لگیں۔ ساتھ ساتھ ان مزدوروں کی بیویوں کو اطلاع کی گئی کہ وہ آن کر یہ نظارہ دیکھیں۔ آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جب بیویاں آئی ہوں گی تو اپنے مردوں کو کسطرح گھسیٹ گھسیٹ کر واپس گھر لے گئی ہوں گی اور کس طرح وہ "بیٹھے رہو ہڑتال" ناکام ہو گئی ہو گی۔



کائنات کے اولین انسان بابا آدم کو بھی اِس مذاق کا شکار ہونا پڑا کہ جب کبھی وہ کہیں گھوم پھر کر کافی مدّت کے بعد اپنی رہائش کے غار کو پہنچے ہیں تو کائنات کی خاتونِ اوّل ان کی پسلیاں گِنا کرتیں کہ کہیں اس میں سے ایک آدھ کم نہ ہو جو اِس بات کا ثبوت ہوتی کہ خالقِ اعظم نے ایک اور عورت پیدا کر کے رقابت کا سامان پیدا کر دیا ہے۔

اور یہ مسئلہ تو آج تک طے نہ ہو پایا کہ اِس دنیا میں سب سے پہلے کون سا فن شروع کیا گیا تھا۔ ایک بار یہی جھگڑا ڈاکٹر، انجینئر اور وکیل کے درمیان کھڑا ہوا۔ ڈاکٹر نے باوثوق طور پر بتایا کہ خدا نے آدم کی تخلیق کے بعد جب حوّا کو آدم کی پسلی سے بنایا تو ظاہر ہے کہ وہ ایک سرجری کا فعل تھا اسلئے ڈاکٹری اوّلین فن ہوا۔ اِس پر انجینئر نے کہا کہ تخلیق آدم سے پہلے تو خدا نے دُنیا کو بنایا اور یہ فنِ انجینئری کا کرشمہ تھا اسلئے انجینئری کو سب سے پہلے فن کا مرتبہ ملنا چاہیئے۔ وکیل نے یہ کہہ کر سب کو لاجواب کر دیا کہ دنیا کی تخلیق سے پہلے کُل کائنات میں ایک انتشارِ عظیم تھا اور اِس قِسم کا انتشار ظاہر ہے کہ وکیل ہی پیدا کر سکتے ہیں۔! یہ تو ہوئی تاریخِ کائنات میں رقابت کی ابتدائی کہانی۔ آج

کے جذباتِ رقابت کی بھی بِپتا سُن لیجیے۔

۲۰ سالہ خوش وخرّم پاک وصاف متاہلانہ زندگی کے بعد ایک صبح یکایک آنکھوں میں آنسو لاکر بیوی نے اپنے شوہر سے کہا:
"پھر جو کبھی میں نے تم کو کسی اور عورت کو اپنے خواب میں پیار کرتے دیکھا تو سُن رکھو کہ تم سے کبھی بات نہ کروں گی۔"

اسی قسم کی باتوں پر ہمارے ایک دوست یاس وحسرت سے ہمیشہ کہا کرتے ہیں "اے کاش ہم اس زندگی میں وہ سب مزے اُٹھا سکتے کہ جنکے متعلق ہماری بیگم کو شبہ بلکہ یقین ہے کہ ہم ان کی غیر موجودگی میں لطف اندوز ہوتے ہیں۔"



جس طرح کارٹون اور کیری کیچر میں کسی ایک بات کو مبالغہ آمیز پیرائے میں دکھا کر مزاح پیدا کیا جاتا ہے اسی طرح لطیفہ گوئی میں بھی اس کی چاشنی بڑا مزہ دے جاتی ہے۔ بے انتہا سردی کے دنوں میں کہ جب خون بھی جم جاتا ہے کسی نے کہا کہ میں منطقۂ منجمدِ شمالی سے آرہا ہوں وہاں پر ہم بات کرتے تھے تو منہ سے نکلے ہوئے الفاظ برف کے ٹکڑے بنکر پٹ پٹ گرتے اور کچھ سنائی نہ دیتا۔ ہم ان کو جمع کرکے آگ پر رکھتے تو پھر ان کے پگھلنے پر آواز پیدا ہوتی۔ اس پر دوسرے نے لقمہ دیا "بے شک صحیح بات ہے ہم کو بھی جب اس آگ کو بجھانا ہوتا تو شعلوں کو توڑنا پڑتا ورنہ شعلے بھی تو برف کی طرح جم جاتے تھے!"

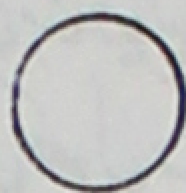
امریکہ کے بڑے بڑے وسیع الرقبہ کھیتوں کا ذکر ہو رہا تھا۔ امریکہ سے ایک نووارد صاحب بتانے لگے کہ ان کے دوست اپنے کھیت دکھانے چلے تو ٹریکٹر پر چلتے چلتے وہ بیج بھی بوتے گئے اور کھیت کے آخری سرے تک جانے میں اتنا وقت لگا کہ واپس آتے آتے فصل تیار تھی اور اس کو کاٹتے ہوئے لوٹے۔

ہندستانی بھلا ایسے موقعہ پر کہاں پیچھے رہتے انہوں نے بتایا کہ اُن کے دادا کے وقت پر ندی کے کنارے کے کھیتوں میں اتنے بڑے تربوز ہوتے تھے کہ ایک وقت کسی نے ایک چھوٹا سا ٹکڑا کاٹنے کو چاقو لگایا تو اتفاقاً وہ چاقو تربوز کے اندر اُتر گیا۔ یہ اپنا پورا ہاتھ ڈال کر ڈھونڈا کئے، تو بھی نہیں ملا۔ مجبوراً وہ خود تربوز کے اندر اُتر گئے اور اِدھر اُدھر اپنا چاقو ڈھونڈھنے لگے، چاقو تو ملا نہیں البتہ ایک اور صاحب انہیں کی طرح کسی تلاش میں گھومتے ملے انہوں نے اپنا ماجرا سنایا تو بولے "ارے بھائی تم کیا اپنے چاقو کی بات لے بیٹھے میں تو دو دن سے اپنے بیلوں کی جوڑی کو کھوج رہا ہوں اُن کا پتہ ہی نہیں لگتا۔"

اب پرانے وقتوں کی بات نکلی تو ایک اور صاحب کہنے لگے "میرے نانا کے پاس اتنا بڑا اصطبل تھا کہ اس میں دو ہزار گھوڑے بندھے رہتے تھے" دوسرے نے کہا "ہمارے خاندان میں بھی یہ بات مشہور ہے کہ ایک اتنا بڑا بانس کا بھالا تھا کہ امساکِ باراں کے موقعہ پر آسمان کے بادلوں میں چھید لگا کر بارش کر لیا کرتے۔" پہلے والے صاحب نے کہا "بھلا اتنا بڑا بانس وہ کہاں رکھا کرتے تھے؟" انہوں نے جھٹ سے کہا "ارے وہ تو آپ کے خاندانی اصطبل میں ہی رکھا رہتا تھا۔"

مبالغہ کی بھی حد اور انتہا ہوتی ہے کسی نے کہا کہ وہ اپنے سفر کے دوران ایک ایسی مشین دیکھ آئے ہیں کہ جس میں ایک طرف سے سالم بکرا ڈال دیجیے، تو دوسری طرف بٹن دبانے پر چاہے سوپ نکال لیجیے، چاہے مٹن چاپ۔ گردہ۔ تلا ہوا بھنا گوشت۔ کباب غرض کہ جو جی چاہے تیار چیز حاصل کر لیجیے۔

اس پر ہمارے ایک ہندستانی دوست سے رہا نہ گیا انہوں نے کہا "آج کل یہاں بھی ایک ایسی قسم کی مشین تیار ہو رہی ہے اس میں مٹن چاپ گردہ گوشت سوپ اور کھال ڈال دیجیے تو دوسری طرف سے زندہ بکرہ نکل آئے گا۔



اشتہار بازی بھی بڑا فن ہے اور اس کے موثر ہونیکا ذکر ہو رہا تھا۔ ایک بڑے رئیس نے کہا "ہم بھی قائل ہیں کہ اشتہار کا نتیجہ بڑا زود رس ہوتا ہے۔ ہم نے بھی ایک مرتبہ اشتہار دیا تھا کہ ہم کو رات کی چوکیداری کے لئے موزوں آدمی کی فوری ضرورت ہے۔ اسی رات ہمارے گھر زبردست چوری ہوئی۔

اشتہار بازی کے بھی نرالے ڈھنگ ہیں۔ "سگریٹ پینا منع ہے۔" والی نوٹس تو آپنے بھی بہت ساری جگہوں پر دیکھی ہوگی۔ سینما ہال میں اسی قسم کے نوٹس کے نیچے سگریٹ کمپنی والوں نے اپنے اشتہار کے لئے بے حساب معاوضہ دیا وہ اس طرح پر کہ "یہاں سگریٹ پینا منع ہے، چار مینار سگریٹ بھی۔"

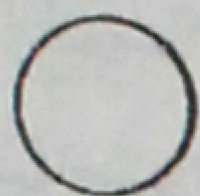
ایک نئی دوکان پر بڑے جلی حروف میں یہ سائن بورڈ آویزاں کیا گیا۔ "یہاں تازہ مچھلی فروخت کی جاتی ہے۔" کسی نے مالکِ دوکان سے اعتراض کیا کہ "یہاں" لکھنے کی کیا ضرورت ہے اس نے بات معقول سمجھ کر "یہاں" مٹا دیا۔ پھر ایک صاحب نے کہا کہ یہ "تازہ" لکھنے کی کیا ضرورت ہے مچھلی تازہ نہ ہو تو آپ کا بیچنا جرم ہو جاتا ہے

یہ بات بھی دل کو لگی اور "تازہ" بھی مٹا دیا گیا پھر کسی نے کہا "فروخت کی جاتی ہے" کا کیا مطلب ہوا۔ دکان ہی کھول رکھی ہے تو مفت تقسیم کے لئے تو نہیں ہے۔ یہ بات بھی واجبی لگی اور یہ بھی مٹا دیا گیا اب صرف مچھلی کا بورڈ لگا رہا اور دوکاندار مطمئن تھے کہ اب کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ مگر جتنے دماغ اتنی باتیں ایک اور صاحب ناک کو دستی لگائے ہوئے گذر رتے گذرتے ٹھہر گئے اور کہا "میں تو مچھلی کی بو اس گلی کے نکڑ سے سونگھ رہا ہوں تو پھر یہ بتانے کی کیا حاجت ہے کہ یہاں پر مچھلی ہے۔

اشتہار بازی کے فوائد کے سلسلہ میں ایک دلچسپ تجربہ یہ بھی ہے کہ کسی صاحب کا بڑا ہی عمدہ اور بڑھیا نسل کا کتا کھو گیا۔ انہوں نے ایک اخبار میں اشتہار دیا کہ جو کوئی اس کتے کو ڈھونڈھ کر واپس پہنچا دے گا اسکو ۲۰۰ روپے بطور انعام دیئے جائینگے اور کتے کی شناخت کے لئے ساری تفصیلات بھی دے دیں۔ جس دن یہ اشتہار شائع ہوا اس کی دوپہر کو یہ اس اخبار کے دفتر گئے یہ دریافت کرنے کیلئے کہ کتے کا کچھ پتہ چلا بھی کہ نہیں۔ جب یہ پہنچے ہیں تو سارا دفتر ہی سونا پڑا تھا۔ دربان چوکیدار سے لے کر مدیر اعلیٰ تک غائب تھے۔ ادھر ادھر پوچھا تو کسی نے بتایا کہ آج جو کتے کے لئے اشتہار چھپا ہے اسی کتے کی تلاش میں سب کے سب گئے ہوئے ہیں۔

کسی خاص برانڈ کے گھی کے متعلق اشتہار دیا جاتا ہے کہ یہ گھی

کھانے والا کبھی بوڑھا نہیں ہوتا' اس کے گھر کبھی چوری نہیں ہوتی اور اس کو کتا نہیں کاٹتا۔ جب اس کی وضاحت چاہی گئی تو بتایا کہ ایسا آدمی جوانی میں ہی داعیٔ اجل کو لبیک کہتا ہے اس لئے بوڑھا نہیں ہو پاتا چونکہ رات بھر کھانسی کے مارے جاگتا رہتا ہے اسلئے چور گھسنے کی ہمت نہیں کرتے اور پھر ناتوانی کے مارے لکڑی کا سہارا لے کر چلتا پھرتا ہے تو کتا اس کے قریب ہی نہیں آتا۔



لطیفوں کی جہاں اتنی ساری قسمیں بیان ہو چکی ہیں وہاں ہندوستان کی تاریخی شخصیتوں کی چشمک اور نوک جھونک کے بھی دو چار قصے سُن لیجیے۔ میرا مطلب ہے بیربل اور مُلّا دوپیازہ۔

دربار میں یہ دونوں شہنشاہ کی آمد کے منتظر باادب باملاحظہ تو بیٹھے ہی تھے لیکن ہوشیار نہ تھے۔ بیربل کی پگڑی سر پر نہیں تھی کہ یکایک شہنشاہ آموجود ہوئے۔ جلدی اور گڑبڑ میں بیربل نے اپنی پگڑی سر پر جو رکھی تو اُلٹی رہ گئی۔ ان کو زک دینے کیلئے ملا دوپیازہ نے شہنشاہ کی توجہ اس طرف مبذول کرائی تا کہ گستاخی سمجھ کر موردِ عتاب ٹھہرائے جائیں۔ اس حرکت کی وضاحت طلب کی گئی تو بیربل نے کہا "عالی جاہ یہ پگڑی اُلٹی اسلئے پہنی گئی ہے کہ اگر بندہ پرور اس خانہ زاد کی پیٹھ کے پیچھے کی طرف سے تشریف لائیں تب بھی اس ناچیز کی طرف سے ادب وملاحظہ میں کوتاہی نہ ہو۔"

روایت ہے کہ دسترخوان پر جہاں دنیا بھر کے لوازمات سجے تھے وہیں پر بیگن کا بھی سالن تھا۔ بادشاہ سلامت نے بیگن بڑے شوق سے نوش جان فرمایا۔ اور بڑی تعریف کی۔ اسپر ملا دوپیازہ

نے اور بڑھ چڑھ کر بیگن کو سراہا۔ نہ صرف اس کے ذائقہ کو بلکہ رنگ و روغن وضع قطع۔ اسکی غذائیت غرض کہ سب ہی زاویوں سے اس کی توصیف کی۔ بات گئی گذری ہو گئی ایک عرصہ کے بعد پھر سے بیگن کا سالن دستر خوان پر چنا گیا۔

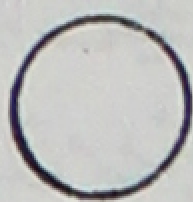
اس بار حضورِ اقدس کے مزاج گرامی پر یہ کچھ گراں گذرے اور شہنشاہ نے مصاحبوں کو ڈانٹا ڈپٹا کہ بیگن بھی کچھ شاہی دستر خوان پر رکھے جانے کی چیز ہے؟ اس پر حسب عادت وحسب روایت ملا دوپیازہ نے ہاں میں ہاں ملائی۔ اور بیگن کی بے انتہا مذمت کی۔

شاہی مزاج کی گرمی کچھ کم ہوئی تو بیربل نے یاد دلایا کہ کچھ ہی دن پہلے ملا دوپیازہ نے بیگن کی تعریف میں زمین و آسمان کو ایک کر دیا تھا اور آج یہ ہجو۔ ملا دوپیازہ نے برجستہ کہا "سرکار والا تبار یہ ناچیز اور حقیر عالی جاہ کا غلام ہے بیگن کا تابعدار تو نہیں کہ اس کی ہر وقت تعریف کروں۔"

شاہی باغ کے صاف و شفاف حوض میں پانی کے فوارے چل رہے تھے۔ موسم دلکش تھا اور باغ کی سیر ہو رہی تھی سارے مصاحب اور حواری ساتھ تھے۔ قبل از قبل تیار کردہ منصوبہ اور تیاری کے مطابق بیربل نے شہنشاہ کے سامنے تجویز رکھی کہ ان کے حکم پر جملہ مصاحب پانی میں کود پڑیں اور حوض میں سے جو بھی دستیاب

ہو حاضر کریں ادھر حکم کی دیر تھی سب ہی غوطہ زن ہوئے اور پہلے سے
رُوبہ عمل لائی ہوئی تدبیر کے مطابق جس جس کو نہیں مرغی کے انڈے چھپائے
ہوئے تھے لے کر ابھر آئے۔ ملا دو پیازہ کو لاعلم رکھا گیا تھا اور ان کی ہتک
کا منصوبہ تھا۔ پانی کے اندر یہ بہت ڈھونڈھے مگر ان کے ہاتھ ایک
بھی انڈا نہ لگا۔ بالآخر یہ خالی ہاتھ باہر نکلے تو ان کا تمسخر اڑایا گیا لیکن یہ
اتنی آسانی سے ہار ماننے والے تو نہ تھے۔

پانی سے باہر نکلے ہاتھ خوب زور زور سے جھٹکے ککڑ کوں
کیا اور بصد ادب معروضہ کیا " عالی جاہ یہ سب ذات کی مُرغیاں ہیں اسلئے
انہوں نے انڈے دیئے ہیں میں تو مُرغا ہوں کہاں سے انڈے دے
سکتا ہوں "۔



عالمگیر مہنگائی اور چڑھتی ہوئی قیمتوں کے اسی دور میں
ایک راجہ کو نئے نئے ٹیکس سوچنے پڑتے تھے اور آئے دن نت نئے
ٹیکس بٹھائے جاتے تھے۔ ایک بار وزیروں نے مشورہ دیا کہ زن
مُریدوں پر بھی ٹیکس عائد کرنا چاہئیے۔ اب یہ تو مسلمہ امر ہے کہ زن
مریدی بھی عالمگیر ہے۔ اور اس طرح پر سرکاری خزانوں میں آمدنی
کا نیا باب کھل گیا۔ دھڑادھڑ خزانے بھرپور ہوتے گئے۔ نئے نئے افسر
مامور کئے گئے جن کا کام ہی یہ تھا کہ گھر گھر تنقیح کریں اور وصولی جاری تھیں
ایک بار اسی محکمہ کے اعلیٰ ترین عہدہ داروں کو شرفِ باریابی عطا کرکے
راجہ صاحب معلومات حاصل کر رہے تھے کہ ایک افسر نے کہا:
"مہاراج اس سلسلے میں میں سارے رئیسوں کے گھر جا چکا ہوں
اور ایک بڑی خوبصورت لڑکی کو دیکھا ہے کہ جو آپ کے پسند پر پوری
اترے گی۔" راجہ صاحب نے کہا "دھیرے بول مہارانی سن لیں گی تو
ہمارا بُرا حال ہو جائے گا۔"

اُس افسر نے فوراً ہی اپنا مطالبہ پیش کیا "مہاراج بھی تو
مہارانی سے ڈرتے ہیں اسلئے زن مریدی کا ٹیکس آپ پر بھی عائد ہوتا ہے۔"

زن مُریدی کو آزمانے کیلئے اسی طرح کسی بادشاہ نے اپنے دربار میں حکم دیا کہ وہ سب جو زن مرید ہیں باہر چلے جائیں اور صرف وہی ٹھہرے رہیں کہ جو زن مرید نہیں۔ اس وقت دربار میں لگ بھگ سو مصاحب تھے۔ وہ سب کے سب دربار سے باہر چلے گئے صرف ایک صاحب دست بستہ حضور میں بغیر جنبش کے کھڑے رہے۔ بادشاہ نے حساب لگایا کہ ایک فی صد تو زن مُرید نہیں اور بڑی خوشی و خوشنودی کا اظہار فرماتے ہوئے پوچھا "کیا سچ مچ تم زن مرید نہیں ؟" انھوں نے بڑی متانت سے جواب دیا۔ "عالی جاہ ایسی بات تو نہیں۔ اصل قصہ یہ ہے کہ بیوی کا حکم تھا جو کبھی ایسا موقعہ آئے تو میں اپنی جگہ سے ہرگز نہ ہٹوں"۔

کسی بیوی نے اپنے شوہر کو طعنہ دیا "شادی سے پہلے تو میں تمھیں بڑا بہادر آدمی سمجھتی تھی"۔ شوہر نے کہا "درست ہے تم سے شادی کرنے چلا تو سب یہی کہتے تھے کہ میں بڑا بہادر انسان ہوں اور میرے حوصلہ کی داد دیا کرتے"۔

کسی نے ایک کمزور قسم کے منحنی اور کم ہمّت آدمی سے پوچھا "تم انسان ہو کہ چوہا" ؟

اُس نے بلا توقف جواب دیا "میں یقیناً انسان ہوں اسلئے کہ میری بیوی تو چوہے سے بہت ڈرتی ہے"۔

مدت دراز کے بعد ملاقات پر سہیلی نے پوچھا "رجنی تمہارے اور تمہارے شوہر کے جھگڑے ابھی ختم ہوئے کہ نہیں؟" رجنی نے کہا کہ "وہ تو کب کے ختم ہو گئے" سہیلی نے اظہار خوشی کرتے ہوئے دریافت کیا "وہ کیسے؟" رجنی نے بتایا "وہ خود ہی جو ختم ہو گئے"۔

ہمارے ایک دوست نے بتایا کہ بیوی کی فضول خرچی سے تنگ آ کر بڑی مشکل سے موقعہ پا کر انہوں نے اپنی بیوی کو کفایت شعاری کا سبق پڑھایا۔

ہم نے پوچھا "کچھ اثر ہوا اس سبق کا؟"

کہا "ہاں! کیوں نہیں، مجھے اپنے سگریٹ اور کلب کے بل کو کاٹ دینا پڑا"۔

اسکے برعکس ہمارے ایک دوست ایک دن اپنی بیوی کی شکایت کرتے ہوئے بولے کہ پرسوں اس نے ۵۰۰ روپے مانگے تھے کل ۳۰۰ اور آج ۱۰۰ روپے مانگ رہی تھی۔ ہم نے پوچھا بڑی فضول خرچ معلوم ہوتی ہیں، پر وہ کرتی کیا ہیں ان روپیوں سے۔ دوست نے بتایا "میں کیا جانوں۔ میں نے تو دیئے ہی نہیں کبھی اسکو روپے"۔

ایک نوکر نے صاحب سے شکایت کی "میں اب آپ کے پاس ملازمت نہیں کر سکتا۔ میں جا رہا ہوں اسلئے کہ مالکن کے ماتحت میں کام نہیں کر سکتا" صاحب نے پوچھا "کیا بات ہے کیا وہ بہت

زیادہ کام لیتی ہیں ؟"

"جی ہاں وہ کام بھی لیتی ہیں اور جو جی میں آئے سخت سست کہتی رہتی ہیں بالکل اسی طرح جیسے وہ آپ کے ساتھ برتاؤ کرتی ہیں۔ کیا وہ نہیں جانتیں کہ میں تو جب چاہوں یہاں سے چلا جا سکتا ہوں"۔

ایک صاحب کو دیکھا کہ قبرستان میں ہر روز ایک قبر پر گھنٹوں آنسو بہایا کرتے ہیں۔ کسی نے استفسار کیا "یہ قبر آپ کے کسی قریبی عزیز کی ہے"۔ کہا "نہیں۔ یہ تو میری بیوی کے پہلے شوہر کی قبر ہے جس کی موت کا مجھے بے انتہا دکھ ہے وہ زندہ ہوتا تو میری شادی اس نیک بخت سے کبھی نہ ہوتی"۔

نئی نئی شادی کے بعد دو دوست آپس میں ملے۔ ہر ایک اپنی بیوی کی تعریف میں رطب اللسان تھا۔ ایک شخص نے کہا "میری بیوی بڑی اچھی مقررہ ہے کسی بھی موضوع پر گھنٹوں تقریر کر سکتی ہے"۔

دوسرے صاحب نے فرمایا "میری بیوی تو بغیر کسی موضوع کے گھنٹوں بول سکتی ہے"۔

"میری بیوی تو راتوں کو خواب دیکھتی ہے کہ کسی کروڑ پتی سے اسکی شادی ہوئی ہے"۔

"اور ہماری بیگم صاحبہ تو دن میں بھی یہی سمجھا کرتی ہیں"۔

صفوۃ اللہ بیگ صوفی شادی شدہ تھے لیکن اپنی بیوی کا تعارف دوست احباب سے نہیں کرواتے، الگ تھلگ رہتے اور موقع ہی نہ آنے دیتے کہ کوئی قریب آجائے۔

ایک دن ہم لوگوں نے انہیں سینما ہال میں بیٹھا دیکھا تو سب کے سب ہی پہنچ گئے اور اس انداز سے مسز صوفی کو دیکھا کہ جسطرح کسی اجنبی کو پہچاننے کی خاطر دیکھا جاتا ہے۔ یہ گھبرا کر بولے "یہ میری بیوی ہیں رابعہ۔ ان سے ملئے"۔ ہم سب نے یک زبان حیرت سے کہا: "ارے یار کل تو تم کسی اور ہی خاتون کو اپنی بیوی بتا کر تعارف کرا رہے تھے!؟"۔

رام لال کی عمر اور اُسکے خیالات سے ہم سب کو یقین ہو چلا تھا کہ وہ اب شادی نہ کرینگے۔ مگر ایک دن انہوں نے بتایا کہ دو تین مہینے سے وہ ایک لڑکی سے مل رہے ہیں وہ بڑی خوبصورت ہے بات چیت بڑے سلیقہ اور دلچسپ انداز میں کرتی ہے یہ دونوں تفریح کے لئے جاتے ہیں اور زندگی بڑی حسین محسوس کرنے لگے ہیں محبت بھی بے انداز ہے۔ رام لال نے ہم سے مشورہ چاہا کہ وہ اس لڑکی سے شادی کرے کہ نہیں؟

ہم نے بغور سنکر کہا "یار ایسی حماقت ہرگز نہ کرنا، اتنے اچھے شب و روز اور اسقدر دلفریب زندگی کو کیوں یکلخت ختم کرنا چاہتے ہو؟"

حمید اور رضیہ مدتوں ایک ساتھ گھومتے پھرتے رہے زیادہ وقت اکٹھے گذارا کئے۔ ایک دن رضیہ نے کہا:

"حمید اب ہم کو شادی کر لینا چاہئے۔"

حمید بولے "خیال تو ٹھیک ہے۔ مگر تم ہی بتاؤ ہم لوگوں سے اب کون شادی کرنا پسند کرے گا؟"

کسی مردوں کے کلب میں عورتوں کا داخلہ بالکل ہی منع تھا لیکن ارکان کی خواہش پر ایک تجویز پیش کی گئی کہ مہینہ میں ایک بار عورتوں کے لئے کلب کھول دیا جانا چاہئے۔ لیکن شرط یہ رہی کہ عورتیں اپنے مرد ممبر کے ساتھ آئیں۔ اسپر کسی کنوارے نے حجت کی کہ اس کی بیوی تو ہے ہنیں وہ کیا کرے۔ اسپر پھر بڑی گرما گرم بحث ہوئی پھر اسی ہماہمی میں تصفیہ ہوا کہ وہ اپنی گرل فرینڈ کو لا سکتے ہیں بشرطیکہ وہ کسی اور ممبر کی بیوی ہو ما



تقریروں کے دوران بھی کافی دلچسپ باتیں وقوع پذیر ہوتی ہیں، ایک صاحب بڑی پرجوش اور سلجھی ہوئی تقریر کر رہے تھے اور چونکہ "دیش کے مستقبل کا سدھار" اُن کا موضوع تھا انہوں نے کہا "میں آنے والی پود سے مخاطب ہوں اور انہیں بتا دینا چاہتا ہوں۔ ...." سامعین لمبی چوڑی تقریر سے بیزار بیٹھے تھے کسی نے دخل اندازی کرتے ہوئے چیخ کر کہا "تب تو کہے جائیے اِتنے میں نئی نسل تیار ہو کر آجائے گی"۔

یہ تو سب جانتے ہیں کہ جب کوئی بولنے کو کھڑا ہوتا ہے تو پھر اُس کو خود اپنے آپ پر قابو نہیں رہتا اور وہ رو کے بھی نہیں رکتا اِسی طرح لمبی تقریر کرتے کرتے مقرر نے اپنی گھڑی دیکھی۔ حاضرین میں سے دو چار نے چلا کر کہا "گھڑی نہیں جنتری ملاحظہ فرمائیے"۔

دوسروں کا تو میں نہیں کہہ سکتا ہیں خود جب کبھی تقریر کرنے کھڑا ہوتا ہوں تو یہ تو اکثر ہوتا ہے کہ تقریر کرنے والے سے زیادہ سامعین بار بار اپنی گھڑیاں دیکھنا شروع کرتے ہیں تاکہ مقرر اِس اشارہ کو سمجھے کہ وقت کافی ہو گیا ہے۔ میں تو اپنی حد

تک اِن باتوں پر کبھی دھیان نہیں دیتا البتہ جب لوگ کلائی کی گھڑیاں دیکھ دیکھ کر تھک جاتے ہیں اور پھر اپنے ہاتھوں کو ہوا میں ہلا ہلا کر دوبارہ گھڑی دیکھتے ہیں تو میں اِس اشارہ کو قابلِ اعتناء سمجھتا ہوں کہ بیچاروں کو یہ لگ رہا ہے کہ گھڑیاں بند ہو گئی ہیں اور وقت آگے بڑھتا ہی نہیں۔

بہت سارے ہمارے دوست ایسے بہادر اور دھن کے پکے ہیں کہ حاضرین میں سے پہلے پہل تو کچھ لوگوں کو اور پھر بعد میں بڑی تعداد میں اٹھ کر جاتے ہوئے دیکھ کر بھی اپنی طول طویل تقریر کا خلاصہ نہیں کرتے، بلکہ ایک دو حضرات بھی سامنے ہوں تو تقریر جاری رکھتے ہیں۔ کسی صاحب نے ایسے ہی موقعہ پر خوشی کا اظہار کیا کہ کم از کم دو چار لوگ بیٹھے ہیں جن کو ان کی تقریر سے دلچسپی ہے۔

اسپر حاضرین نے یک زبان ہو کر کہا "ہم آپ کے بعد بولنے والے ہیں اسلیئے یہاں بیٹھے ہیں"۔ ایک اور موقعہ پر تو وہ بچے کھچے دو چار آدمی منتظمین جلسہ بھی نہیں بلکہ لاؤڈ اسپیکر اور بجلی بند کرنے والے کاریگر نکلے۔

عام طور پر تقریر کرنے والوں سے اونچا طبقہ اُن مقرروں کا ہوتا ہے کہ جو کھانے کی دعوتوں پر بلائے جاتے ہیں اور ڈنر کے بعد اُن سے تقریر کی فرمائش کی جاتی ہے۔ ایسے ہی ایک موقعہ پر کسی نے

مہمانِ خصوصی کا تعارف کراتے ہوئے مذاق کے پیرایہ میں کہا "یہ نہایت ہی بلند پایہ مقرر ہیں اور ان کی خصوصیت یہ کہ ادھر انہیں کھانا کھلائیے ادھر تقریر نکل آتی ہے"۔ مقرر صاحب نے اپنی تقریر پوری کی اور تعارف کرانے والے صاحب کی تعریف یوں کی "ہمارے دوست بھی تقریروں میں کچھ پیچھے نہیں مگر فرق یہ ہے کہ ادھر انہوں نے ڈنر کے بعد تقریر شروع کی اور ادھر منہ سے کھانا نکل آیا"۔

یہ تو سب باتیں بہادر مقررین کی تھیں بعض تو ایسے بھی ہوتے ہیں کہ تقریر سے بچنے کے لئے بڑی قیمت بھی ادا کرنے کو تیار ہوتے ہیں اور بالخصوص ڈنر کے بعد کی تقریر تو ان کو بہت بھاری ہوتی ہے بلکہ ان کی حالت تو سلطنت روم کے زمانہ کے شیر ببر کی سی ہوتی ہے کہ جسکو کئی دن تک بھوکا رکھ کر قیدیوں کو اس کے پنجرے میں چھوڑا گیا اور جیسے ہی قیدی کو ہڑپ کرنے کیلئے شیر ببر آگے بڑھا۔ قیدی نے فوراً اسکے کان میں کہا "خبردار ہم کو ڈنر بنا کر کھایا تو پھر ڈنر کے بعد کی تقریر بھی کرنا پڑے گی"۔

سنتے ہی شیر ببر فوراً پیچھے ہٹ گیا اور ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ کیونکہ ڈنر کے بعد کی تقریر سے وہ فاقے سے مر جانا بہتر سمجھتا تھا۔



کاہلی، سستی اور احدی پن کی بھی انتہا ہوتی ہے۔ ہمارے دوست رضا اس اصول کے سختی سے پابند ہیں کہ جہاں لیٹ سکتے ہیں وہاں بیٹھنا نامناسب ہے۔ جہاں بیٹھ سکتے ہیں وہاں پر کھڑا رہنا غلطی ہے اور جہاں کھڑے رہ سکتے ہیں وہاں چلنا حماقت ہے۔

ہم تین دوست آپس میں گپ شپ لڑا رہے تھے۔ سوال ہوا کہ کسی دن نیند سے اٹھنے پر ہم کو یہ پتہ چلے کہ ہم لکھ پتی بن گئے ہیں تو ہم کیا کریں گے؟ ایک نے کہا "ہم تو سیدھے پیرس جائیں گے اور خوب مزہ کریں گے۔" ہم نے کہا "کسی منفعت بخش کاروبار میں روپیہ لگائیں گے"۔ رضا نے کہا "میں تو پھر سے سونے کی کوشش کروں گا تاکہ اور دو چار لاکھ مل جائیں۔"

کسی نوجوان سے اس کے مستقبل کی باتیں ہو رہی تھیں فراہمی روزگار میں موجودہ بحران۔ کساد بازاری۔ معاشی دقتوں اور سرکاری نوکریوں میں جھنجھٹوں کی باتیں دہرائی گئیں پھر اُن سے پوچھا گیا کہ آگے چل کر وہ کیا بننا چاہیں گے؟ انہوں نے جواب دیا "میں ایک مالدار ریٹائرڈ تاجر بننا چاہوں گا۔"

کچھ اسی قسم کی روئداد امریکن انڈین (ریڈ انڈین) کی ہے
یہ اپنے محروسہ علاقوں میں امن چین کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ بے انتہا
قانع اور متوکل۔ انڈین کارن (مکئی کے بھٹے) کھاتے ہیں۔ بھیڑ پالتے
ہیں جنکے بالوں سے بلانکٹ بنتے ہیں۔ اور مستقبل تو مستقبل کل کی
فکر نہیں کرتے۔ سرکاری محکمہ کے عہدہ داران کی فلاح و بہبود کی اسکیمیں
بناتے ہیں مگر وہ چلتی نہیں۔ اُن کو کام کی طرف مائل کرنے کیلئے لکچر دیئے
جاتے ہیں مگر وہ کان نہیں دھرتے۔

ایکبار ہم بھی سمجھانے لگے "دیکھو تمہاری بہتری کے لیے جو کارخانے
کھولے جا رہے ہیں ان میں کام کروگے تو روپیہ کماؤگے"۔ اُنہوں نے
نے پوچھا کہ روپیہ کما کر کیا کریں؟" ہم نے کہا اچھا مکان بنا سکوگے
فرنیچر سے اسکو آراستہ کر سکوگے۔ تو پھر پوچھا کہ اسکے بعد کیا؟
ہم نے بتایا کہ خوب محنت سے روپیہ کمانے کے بعد اچھی سے اچھی
زندگی بسر کرنے کو ملے گی۔ اُن کی وہی ایک رٹ کہ پھر؟ ہم نے زچ
ہو کر کہا" محنت کی زندگی کے بعد پھر ریٹائر ہو کر آرام کی زندگی گزار
سکوگے۔ بہت دیر سوچ کر بڑی پتہ کی بات بتائی" ساری زندگی
محنت و مشقت سے بتا کر بالآخر آرام کی زندگی ملے گی یہی نا؟ وہ
وہ تو ہم آج بھی آرام اور چین سے ہی گذار رہے ہیں۔"
سستی اور کاہلی کا ذکر چلا ہے تو یہ بھی سن لیجئے کہ بشر

کے درخت کے تلے دو آدمی آنکھیں بند کیے پڑے تھے اُن میں سے ایک نے پاس سے گذرنے والے شخص سے درخواست کی:

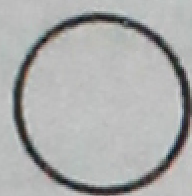
"بھیّا یہ جو بیر یں زمین پر پڑی ہیں انہیں اُٹھا کر میرے منہ میں تو ڈال دینا۔" اس پر دوسرے آدمی نے خوابِ خرگوش سے جاگتے ہوئے کہا "میرا ساتھی بڑا احدی اور نکمّا ہے آپ ہرگز اس کے منہ میں بیر نہ ڈالئے۔ یہ سستی کے مارے ہاتھ بھی نہیں ہلاتا۔ کچھ دیر پہلے ایک کتّا میرا منہ چاٹ رہا تھا اور میں نے اس سے لاکھ کہا کہ کتّے کو دھتکار دے مگر اس کو ذرا سی بھی جنبش نہ ہوئی۔"

ایک بار رضا کو باغ کی بنچ پر آنکھیں بند کئے بیٹھا دیکھا تو ہم بھی کچھ دیر کے لئے ٹک گئے۔ باتوں باتوں میں انہوں نے کسی اور کی طرف اشارہ کر کے کہا "میری نظر میں وہ شخص کاہل ترین ہے۔ کوئی دو گھنٹے سے یوں ہی چپ چاپ بیٹھا ہے"

ہم نے پوچھا کہ انہوں نے اس کو کاہل ترین کیوں قرار دیا۔ رضا کا جواب سیدھا سادھا تھا "میں خود جو اس کو اپنی آنکھوں سے اسی طرح سست بیٹھے دیکھ رہا ہوں۔"

مدتوں بعد ہمارے دوست سے اچانک ملاقات پر صاحب سلامت اور خیر و عافیت کے بعد ہم نے پوچھا کہ ان کا بڑا لڑکا کیا کر رہا ہے؟ انہوں نے خوشی خوشی بتایا کہ وہ آج کل سوا لاکھ

کی بہترین موٹر میں دن تمام شہر کا گشت لگاتا پھرتا ہے۔ اس کا بٹوہ روپیوں سے بھرا ہوتا ہے۔ ہم نے مبارکباد دی اور کہا "خوب خوب، ماشاءاللہ آپ کے لڑکے نے کم عمری ہی میں خوب ترقی کی جو اتنا بڑا رئیس بن گیا۔ آخر وہ کرتا کیا ہے؟"
جواب ملا "بس کی کنڈکٹری!"



تعلیمی معیاروں اور قدروں کے بدلتے ہوئے دور میں دُنیا کے تمام مضامین مدرسوں کے نصاب کا جزِ لاینفک بنتے جا رہے ہیں سوائے دینی تعلیم کے۔ یہ اسلئے کہ ہمارا دیس لامذہبیت کی بنیادوں پر قائم ہے۔ تعلیم کی ترقی کے معنیٰ اب یہ ہو گئے ہیں کہ جہاں اور سب باتیں سکھائی جائیں ابتدائی مدرسوں میں ہی نو عمر بچّوں کو جنسیات اور صنفیات کی بھی مکمل تعلیم دے دی جائے۔

مغربی ممالک میں پھول اور تتلی کے سبق مدّت سے عام ہو چکے ہیں تاکہ چھوٹے چھوٹے بچّوں کے لئے بھی حیاتیات (حیوانیات اور نباتیات) کے سربستہ راز آشکارا کر دیئے جائیں چنانچہ "اخلاقی و سماجی پاکیزگی" کی کل ہند کانفرنسوں میں اس مسئلہ پر بحث ایک لازمی جزو ہو گئی ہے اور اس کے تعلق سے ریزولیوشن پاس کئے جاتے رہے ہیں کہ بچّوں کو وہ سب باتیں بتا دینا چاہیے کہ جو قدرت نے بھی راز بنا رکھے ہیں اس تحریک کا پس منظر یہ ہے کہ جو سیدھے سیدھے طریقہ سے یہ باتیں نہیں بتائی گئیں تو ڈر ہے کہ گندے اور غلط معنوں کے ساتھ وہی باتیں کسی اور ذریعہ سے ان نونہالوں کے سامنے آجائیں گی۔ ایک ایسی ہی کانفرنس میں جب

یہ موضوع زیر بحث تھا میں نے امریکہ میں سنا ہوا ایک سچا واقعہ دہرایا۔ مکتب
سے واپسی پر ایک نوعمر لڑکے نے اپنی ماں سے پوچھا کہ وہ کہاں سے اور کیسے
آیا۔ ماں نے سوچا کہ بچہ میں شعور جاگ رہا ہے اور ایسے موقعہ پر اسکو صحیح
بات نہیں بتائی گئی تو شاید وہ غلط سلط باتیں سیکھ جائے گا۔ کئی دن تک
حیاتیات کے اس مسئلہ پر کتابیں پڑھ پڑھ کر اپنے بچے کو پھول اور
تتلی والی باتوں سے لے کر حیوانیات کے مضمون سے تفصیلات جمع کر کے
عام فہم اور سلیس پیرائے میں سب کچھ بتا دیا اور پھر آخر میں اپنے بچے
سے دریافت کیا "جان یہ تو بتاؤ کہ آخر تم نے یہ سوال کیوں کیا؟"
بچے نے انتہائی معصومیت اور لاابالے پن سے جواب دیا "ممی
ہمارے اسکول میں ایک نیا لڑکا آیا ہے وہ کہتا تھا کہ وہ کیلی فورنیا
سے یہاں پر آیا ہے۔ میں بھی جاننا چاہتا تھا کہ میں کہاں سے اور
کیسے آیا ہوں!"

اسی سلسلہ کا ایک اور پُر لطف قصہ ہے کہ ماں باپ نے از خود
اس موضوع پر اپنے چھوٹے بچے کو جنسیات سے ہٹ کر روایتی کہانیوں
کے ذریعہ معلومات دینے کی خاطر سے دلچسپ کہانیاں سنائیں لیکن
صاحبزادے آج کل کے ماحول کے پروردہ تھے ان کی معلومات شاید
والدین سے زیادہ ہی تھے انہوں نے سب کچھ سن کر پھر سوال کیا "تو
پھر اس دنیا میں آپ اور آپ کے والدین اسی طرح آتے رہے ہیں؟"

اور جب ان کے سوال کا جواب اثبات میں دیا گیا تو انہوں نے بڑی مایوسی کا اظہار کرتے ہوئے کہا "تب تو اپنے خاندان اور آباواجداد میں شائد جنسی تعلقات کا سلسلہ رہا ہی نہیں"۔

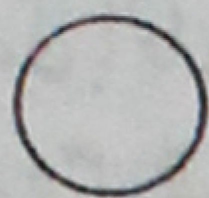
کہتے ہیں کہ مغربی ماحول میں جب کمسن لڑکی کو صحیح معلومات دینے کی خاطر ماں اور بیٹی کی اس موضوع پر گھنٹوں بات چیت رہی تو اس کے بعد ماں نے اپنی سہیلی سے کہا "میری اور میری بیٹی کی آج کی بات چیت سے بڑا فائدہ ہوا۔ میں نے بہت سی باتیں جان لی ہیں"۔

کتابوں کی دکان پر ایک خاتون نے دریافت کیا "پرندوں اور تتلیوں سے متعلق کوئی کتاب ملے گی؟"۔ دکاندار نے پوچھا "جی کیا آپ کو حیاتیات کی کتاب چاہیئے کہ جس میں زندگی کے حقائق صنفیات اور جنسیات کے معلومات ہوں؟"

خاتون نے برافروختہ ہو کر کہا "میں نے چھ بچے پیدا کئے ہیں اور سب ہی کو صنفیات اور جنسیات کے جملہ معلومات ہیں مجھے تو صرف پرندوں اور تتلیوں پر کتاب چاہیئے"۔

مہذب دنیا میں ہر ایک اپنی بالغ ہونے والی اولاد کو پھول اور بھونرے کی کہانی سنا کر جنسی اور صنفیاتی سبق سکھاتا ہے۔ ایسے ہی ایک لڑکے کی ماں نے موقعہ کی نزاکت کو سمجھ کر اپنے شوہر کو مشورہ دیا

کہ وہ لڑکے کو پھول اور بھونرے کی باتوں سے آگاہ کردے۔ باپ نے بہت سوچ بچار کے بعد لڑکے کو اپنے کمرہ میں بلایا اور یاد دلایا کہ کچھ دن پہلے وہ پیرس گئے تھے وہاں ایک نائٹ کلب میں دو شوخ وطرار لڑکیاں ملی تھیں پھر ان دونوں کو یہ اپنی خوابگاہ میں لے گئے تھے۔ اور وہاں پر انہوں نے بڑی خوشگوار رات گذاری تھی اور پھر کہا "تو بیٹے پرندوں بھونروں اور پھولوں کی بھی بس یہی ایک کہانی ہے"۔



محافظِ جسم و جاں ڈاکٹروں کے تعلق سے بہت ساری باتیں کہی سنی جاتی ہیں اور نت نئے قصے گڑھے جاتے ہیں۔ ہم بھی اپنے ایک بڑے مخلص دوست کو جو اچھے خاصے ڈاکٹر بھی تھے یہ کہہ کر ستایا کرتے کہ بھئی سمیع تم تو ایسے ڈاکٹر ہو کہ جنکے مریض نہ تو جنّت میں جاتے ہیں نہ دوزخ میں بلکہ دنیا میں دم توڑنے کے بعد جب روح قفس عنصری کو پرواز کرتی ہے تو یہ برزخ میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔ نہ تو جنّت کے دربان رضوان کی فہرست میں ان کا نام ہوتا ہے اور نہ دوزخ کے پاسبان کے پاس یہ جگہ پوچھتے پھرتے ہیں کہ ان کا بھی کہیں ٹھکانا ہے مگر ہر جگہ نفی میں جواب ملتا ہے۔ اور اب تو عرش بریں پر سب کو یہ معلوم ہو ہی چکا ہے کہ جب کوئی بیمار پڑتا ہے اور ان کے پاس رجوع ہوتا ہے اپنی زندگی کے دن پورے نہیں کرنے دیتے بلکہ وقت سے پہلے عدم آباد کو روانہ کر دیتے ہیں یہ ہے اُن کی تشخیص اور تجویز کی خوبی۔

مگر اُن کا مشاہدہ تھا کہ جو مریض ان کے پاس آتے وہ ویٹنگ روم میں بیٹھے بیٹھے بالعموم آپس میں اپنے اپنے دکھ درد کی باتیں کرتے کرتے

بیماریوں کی جملہ علامتوں کو ایک دوسرے سے پوچھ کر خود اپنے پر دوسرے کی بیماری کو لاگو کر لیتے اور ڈاکٹر کے سامنے وہ سب دہرانا شروع کرتے کہ جو دوسروں سے سنا ہے اسلیئے انہوں نے ایک سائن بورڈ لگا رکھا تھا "مریضوں سے استدعا ہے کہ وہ دوسروں کی بیماریوں کی علامتوں کو نہ اپنالیں — بالخصوص مستورات"۔

ایک بار ڈاکوؤں کی ٹولی نے ایک ٹرین کو بڑی سنسان جگہ پر روکا اور سب کو لائن میں کھڑا کر کے پستول بتا بتا کر کہا "جو کچھ روپیہ پاس ہیں ہوں نکالو ورنہ جان سے جاؤ گے روپیہ دو جان بخشی جائے گی"۔ جب ڈاکو روپیہ پیسہ اکٹھا کرتے ایک صاحب کے سامنے پہنچے اور یہی سوال دہرایا تو وہ بڑی جولانی کے ساتھ ہنسے قہقہے مار مار کر۔ ڈاکو برداشت نہ کر سکے سختی سے پوچھا اس کا کیا مطلب ؟ تو یہ بولے تم لوگ تو بدھو لگتے ہو روپیہ دو جان بچالو کے کیا معنی۔ دیکھو میں ایک ڈاکٹر ہوں میں تو لوگوں کا روپیہ پیسہ بھی لیتا ہوں اور ان کی جان بھی"۔ اسی لیئے تو کہتے ہیں کہ ڈاکو منہ پر کالا نقاب لگاتے ہیں اور سرجن ڈاکٹر سفید نقاب۔

اور تمام ڈاکٹروں کی طرح ہمارے دوست ڈاکٹر سمیع اللہ کی تحریر اور خط ایسا تھا کہ شاید ہی کوئی پڑھ سکتا ہو لیکن یہ جان کر کہ کمپونڈر اور دواساز تو سبھی ڈاکٹروں کی تحریر بآسانی پڑھ لیتے ہیں، ہم بھی اُن کے خطوط دواساز سے پڑھوالیا کرتے لیکن ایک بار

نیا شخص کام کر رہا تھا ابھی ہم اپنا مدعا بیان بھی نہ کرنے پائے کہ وہ خط ہمارے ہاتھ سے لے کر اندر چلا گیا اور دس منٹ بعد اسی خط پر دوا دول کا مکسچر تیار کر کے لا لایا۔

چونکہ یہ بہت بارسوخ اور اثر والے ڈاکٹر تھے ہم نے ان کے لکھے ہوئے نسخوں سے بہت فائدے اٹھائے کبھی اس کو سفارشی خط کی طرح حصول نوکری میں پیش کر دیا کبھی اسکو سینما کے مینیجر کو بتا کر سینما میں بغیر ٹکٹ کے داخلہ لے لیا تو کبھی انکم ٹیکس افسر کو بتا کر اپنے ٹیکس کی الجھی ہوئی کارروائیوں کو اپنی موافقت میں طے کرا لیا۔

یہ جب کبھی اپنے ساتھی ڈاکٹر سے کہیں پر ملتے تو فوراً اپنا آلہ تشخیص اس کے سینہ پر لگا کر کہتے "یار تمہاری صحت تو خوب ہے بتاؤ میں کیسا ہوں؟"

ان کی نئی نئی شادی ہوئی اور یہ اپنی انگریز بیوی کے ساتھ کہیں سیر پر چلے تو راستہ میں ایک بنی ٹھنی گڑیا سی چنچل عورت نے مسکرا کر ان کو سلام کیا۔ انہوں نے اپنی بے تعلقی اور معصومیت جتانے کو بطور صفائی بیوی کو بتایا کہ وہ اسکو پیشہ ورانہ حیثیت سے جانتے ہیں بیوی نے جھٹ سے سوال کیا "کس کے پیشہ کی وجہ سے۔ تمہارے یا اسکے"

ہمارے انہیں ڈاکٹر صاحب سے روایت منسوب ہے کہ ایک نوجوان لڑکی طبی مشورہ کے سلسلہ میں ان کے پاس آئی تو انہوں نے

امتحان و معائنہ کے بعد کہا "مسز راجپال خوشخبری سنئے .... ان کو ٹوک کر اس عورت نے بتایا کہ وہ مسز راجپال نہیں بلکہ مس راجپال ہے۔" اوہ تب تو مس راجپال آپ کے لئے بری خبر ہے کہ آپ بچّہ کی ماں بننے والی ہیں"۔

یہ چونکہ عورتوں کی بیماریوں کے ماہر تھے۔ اُمیّد سے رہنے والی (حاملہ) عورتوں کو ابتدائی نوبت پر ہی یہ خوشخبری سناتے ہوئے نہ مٹنے والی سیاہی سے پیٹ پر ایک ربر اسٹامپ لگا دیتے جس کی عبارت سادے طریقہ پر پڑھی نہیں جا سکتی مگر اس پر یہ لکھا ہوتا "جب آپ یہ عبارت بغیر خوردبین کے پڑھ سکیں تو فوراً ہسپتال میں شفٹ ہو جائیے"۔ اس کا مطلب یہ ہوتا کہ اس وقت نواں مہینہ شروع ہو جاتا۔

ایک بار ان سے طبّی مشورہ لے کر ایک مریض جانے لگا تو انہوں نے کہا "مشورہ کی فیس دس روپیہ تو دیتے جائیے" آپ کے مشورہ عمل کرنا ہی نہیں تو فیس کا کیا سوال"۔ مریض کے جواب نے لاجواب کر دیا۔

کلب میں بیٹھے بیٹھے ایک متعارف نے اپنی کسی بیماری کے علاج کا مشورہ چاہا۔ انہوں نے کچھ دوائیں تجویز کیں اور مہینہ کے ختم پر طبّی مشورہ کا بل روانہ کر دیا۔ اس کا انہیں کوئی جواب نہ ملا تو انہوں نے اپنے ایک وکیل دوست سے مشورہ کیا کہ ایسی صورت میں کیا

کرنا چاہیے۔

وکیل صاحب نے حیرت سے پوچھا "تو کیا آپ ہی وہ ڈاکٹر تھے جنہوں نے اُن کو بل بھیجا تھا؟! انہوں نے مجھ سے قانونی مشورہ طلب کیا تھا تو میں نے ہی کہا تھا کہ کوئی جواب نہ دینا اور اپنے قانونی مشورہ کی فیس کا بل بھیجا ہوا ہے۔"

میبل ہر سال اپنے چھوٹے سے گاؤں سے شہر کے ہسپتال کو زچگی کے لئے آیا کرتی اور یہ سلسلہ دس سال تک چلتا رہا۔ دسویں زچگی کے بعد ڈاکٹر نے مسکرا کر پوچھا:

"تو پھر اب کے سال تم آؤ گی نا؟"

میبل نے کہا "ہرگز نہیں ڈاکٹر۔ ابھی ابھی میں نے اور میرے شوہر نے یہ بات جان لی ہے کہ یہ ساری مصیبت کس وجہ سے ہوتی ہے۔"



عقلمندوں کی باتیں تو عقل دادراک سے بھرپور ہوتی ہی ہیں کبھی اُن کی باتیں بھی تو سنی ہوں گی آپنے کہ جنکو دُنیا فاترالعقل کا خطاب دے کر سوسائٹی سے باہر کر دیتی ہے اور اُن کے متعلق سب کچھ بھول جاتی ہے۔ خیر اب تو پہلے کی طرح ان کو پاگل خانہ میں نہیں بلکہ علیحدہ مخصوص دواخانوں میں رکھا جاتا ہے کہ جہاں ان کا علاج ہوتا ہے اب بتائیے اس دُنیا میں ایسے کتنے مکمل انسان ہیں کہ جو دوسرے کو کم عقل اور اپنے آپ کو بلا حجاب عقلمند کہہ سکتے ہیں۔ ایک مچھلی کے شکار کے شوقین کسی بڑی اونچی دیوار کے سایہ میں ندی کنارے بیٹھے شکار کا شوق فرما رہے تھے۔ اس اونچی دیوار پر سے کسی نے جھانک کر دریافت کیا کہ کیا شغل ہو رہا ہے؟ انہوں نے اپنی بات بتائی تو پھر پوچھا کہ کچھ مچھلی ہاتھ لگی جواب دیا کہ نہیں، تو پھر دریافت کیا کب سے بیٹھے ہو تو اس نے بتایا کہ صبح سے۔ اس پر ان مچھلی پکڑنے والے صاحب سے کہا "تو پھر آپ اندر ہمارے ساتھ کیوں نہیں آکر رہ جاتے"!

وہ دیوار تھی دماغی بیماریوں کے ہسپتال کی اور مشورہ دینے والے تھے اس کے مکین۔

کسی پاگل خانہ میں ایک بڑے عہدہ دار بغرض معائنہ تشریف لے گئے۔ ادہر ادہر گھومتے ہوئے انہوں نے دیکھا کہ ایک درخت کے نیچے ایک معقول صورت صاحب محو مطالعہ بیٹھے ہیں انہوں نے دریافت کیا "جناب آپ یہاں کیسے آئے یا لائے گئے؟" پاگل خانہ کے اس مکین نے بتایا کہ انہوں نے ایک نئے مذہب کی بنیاد ڈالی ہے اور پھر اس کے سارے مسلک اور اصول بتلائے جو یکجہتی انسانیت اخوت اور اسی طرح کی اچھی اچھی باتوں کا مجموعہ ہیں۔ عہدہ دار اُن کی سمجھداری کی باتوں سے کافی مرعوب و متاثر ہوئے اور پوچھا کہ یہ باتیں تو ایسی ہیں کہ دنیا کو آپ کی قدر کرنا چاہئے تھی یہاں کیوں پہنچا دیا؟ تو وہ بولے "خدا نے مجھے پیغمبر بنا کر بھیجا تھا تاکہ جاہلوں کو راستہ دکھاؤں، لیکن لوگ میرے دشمن ہو گئے"۔

وہیں کہیں پاس میں ایک اور صاحب بیٹھے بڑے غور و خوض سے یہ باتیں سن رہے تھے اور جب انہوں نے یہ دعوی سُنا کہ خدا نے پیغمبر بنا کر بھیجا ہے تو یہ انتہائی رعونت اور خفگی کے عالم میں چلائے "یہ جھوٹ بکتا ہے ہم نے اس کو کبھی پیغمبر بنا کر نہیں بھیجا"۔

روایت ہے کہ موسلا دھار بارش کی ایک تاریک رات میں کسی ملک کے وزیر اعظم کی گاڑی راستہ میں بگڑ گئی۔ اپنے نوکر کے ساتھ

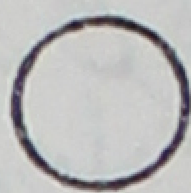
جھلملاتی روشنی کا سہارا لے کر ایک بڑی بھاری بلڈنگ کے پاس پہنچ کر انہوں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ دروازہ کھلنے پر بتایا کہ وہ وزیر اعظم ہیں اور رات کو انہیں سہارا چاہیئے۔ ان کو فوراً داخلہ کی اجازت دے دی گئی اور دربان نے کہا "اندر تشریف لائیے یہاں پر پہلے سے نصف درجن وزیر اعظم موجود ہیں آپ ایک اور سہی۔ یہ تو یہاں کا سب سے بڑا پاگل خانہ ہے۔"

کہیں اعداد و شمار کے ماہر بیٹھے تھے انہوں نے یہ راز افشا کیا کہ پاگل خانوں میں مردوں کی تعداد عورتوں کے مقابلہ میں تقریباً دگنی ہے۔ اس پر کسی نے دریافت کیا کہ مردوں کو پاگل خانے بھجوانے کی ذمہ داری کس پر ہے؟

پاگل خانہ میں ایک معقول صورت آدمی بیٹھا ہوا اخبار کے پرزے پرزے کر کے اِدھر اُدھر بکھیر رہا تھا کسی نے پوچھا کہ یہ کس لئے؟ جواب ملا "اسطرح پر میں دیوانے کتوں کو بھگا رہا ہوں۔" اِرد گرد کہیں ایک کتا بھی نظر نہ آنے پر پاگل سے استفسار کیا:
"مگر یہاں پر تو کتے کہیں نظر نہیں آتے؟"
پاگل نے جواب دیا "ہاں میری اسی کارگر تدبیر کی وجہ سے تو آپ کو آس پاس کتے نظر نہیں آتے۔"

ایک نیم پاگل آدمی کو چھوٹے سے شہر کی بلدیہ نے ۳۰ روپیہ

ماہوار تنخواہ مقرر کی اور اس کو یونہی اس کام پر لگایا کہ شہر کے باغ میں رکھی ہوئی توپ کو روز صاف کر دیا کرے۔ اس نیم پاگل نے ۱۲ سال تک اس کام کو خوب جانفشانی اور دلدہی سے انجام دیا اور پھر بلدیہ کے دفتر میں آکر اپنا استعفیٰ پیش کر دیا۔ بلدیہ کے عہدہ داروں نے پوچھا "کیا اب تم کو یہ کام پسند نہیں رہا؟" اس نے جواب دیا "مجھے بے حد پسند ہے مگر ان تمام برسوں میں میں نے کافی روپیہ بچا کر جمع کر لیا ہے۔ اب میں خود اپنی توپ خریدوں گا اور اپنا کاروبار چالو کر دوں گا۔"



بسا اوقات سیدھی سادھی بات کو بھی توڑ مروڑ کر مزاح پیدا کیا جاتا ہے لیکن کبھی کبھی اس سے کسی کی عزّت کو دھکّا بھی لگ سکتا ہے۔

عرصہ ہوا ایک بہت بڑے پادری صاحب نیویارک کے ہوائی اڈے پر اترے جہاں ان کے ہزاروں معتقدین استقبال کے لئے موجود تھے وہیں صحیفہ نگار اور پریس کے نمایندے بھی حاضر تھے۔ ان میں سے کسی نے موقعہ ملتے ہی پوچھا کہ کیا عزّت مآب امریکہ کے کسی نائٹ کلب کو دیکھنا چاہیں گے؟

پادری صاحب نے اس مہمل اور لایعنی سوال کا جواب راست دینے کے بجائے خوش مذاقی کو قائم رکھنے کی نیت سے یونہی پوچھا "کیا یہاں پر فی الواقعی اچھے نائٹ کلب موجود ہیں؟"

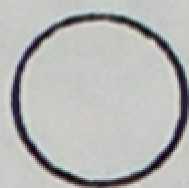
بات آئی گئی ہو گئی لیکن اخبارات میں جلی حروف میں یہ عنوان قائم کیا گیا

"عزّت مآب پادری صاحب کا نیویارک کے ہوائی اڈہ پر پہلا سوال، کیا یہاں پر اچھے نائٹ کلب موجود ہیں!؟"

کسی صاحب نے صبح ہی صبح مقامی اخبار میں خود اپنے انتقال کر جانے کی خبر چھپی ہوئی دیکھی تو مُدیر کو ٹیلی فون کر کے کہا:

"آج آپ کے اخبار میں میری موت کی جو خبر چھپی ہے......"

آگے یہ بتانا چاہتے تھے کہ وہ غلط ہے لیکن مُدیر نے بیچ میں اُلٹا سوال کیا "تو پھر آپ کہاں سے بول رہے ہیں؟"



آپ بھی سوچتے ہوں گے کہ سرکاری دفتروں میں ایسا ثقیل اور کثیف ماحول ہوتا ہے کہ وہاں کسی لطیفہ کے پیدا ہونے کی شاید ہی گنجائش ہو لیکن میں نے پہلے ہی عرض کر دیا ہے کہ موز کے چھلکے سے پھسل کر بھرے بازار گرنا عوام الناس اور تماش بینوں کے لئے تو ہنسی کا سامان ہو سکتا ہے اور دیوار قہقہہ کھڑی ہو سکتی ہے لیکن گرنے والے کی درگت کا کون مداوی کر سکتا ہے۔

کسی دفتر میں ایک کام چور مگر ہوشیار قسم کے کام چلاؤ صیغہ دار تھے۔ ان کی میز پر جو بھی پیچیدہ مثل آتی وہ کوئی نہ کوئی ریمارک پاس کر کے لکھ دیتے کہ بھاؤ صاحب اس کو دیکھیں۔ اسی ڈگر پر کام چلتا رہا، ان کی میز صاف ہی رہی اور یہ مزے کرتے رہے بلا یہ جانے کہ کوئی بھاؤ صاحب دفتر میں ہیں بھی۔ ایک مدت کے بعد ان کو دیر تک ٹھہرنا پڑا تو اتفاقیہ کسی نے پوچھا کہ بھئی تم تو آنے والوں میں سب سے پیچھے اور جانے والوں میں سب سے پہلے رہتے ہو آج یہ کیا بات ہے تب انہوں نے بتایا کہ میری کارکردگی کا راز تو یہ ہے

کہ میں سب ہی کچھ بھاؤ صاحب کے گلے میں ڈال دیتا ہوں۔ اس شخص نے پوچھا کہ جانتے بھی ہو کہ یہ بھاؤ صاحب کون ہیں۔ انہوں نے جواب دیا:

"میری بلا جانے کون ہے میں تو صرف کام ڈھکیل دیتا ہوں۔"

وہ صاحب چمک کر اٹھے اور ان کا گلا دبوچ بیٹھے کہ انہیں آج پتہ چلا کہ وہ کرم فرما جو سارا کام ان کی طرف کھسکا دیتے ہیں یہی ہیں اور جن کے مارے اُن کو حیرانی و پریشانی کے سوا کام کا بوجھ رہا کرتا ہے۔

تکمیل ضابطہ اور کاغذی طول عمل کے تعلق سے یہ تاریخی واقعہ تو نہیں ہے لیکن ضرور تاریخ میں نمایاں طور پر لکھا جائے گا۔ سرکاری ملازمت سے حُسن خدمت پر علیحدہ ہونے والوں کو ہر سال ایک وثیقہ پیش کرنا ہوتا ہے کہ وہ سال تمام حین حیات تھے۔ چنانچہ ایسی حیاتی کے سرٹیفکٹ کی بنا پر ہی وظیفہ کی رقم کی اجرائی و ادائی ہوتی ہے یہ ایک بے حد ضروری ضابطہ کی تکمیل ہے اور ہر ایک اسکی عمل آوری کرتا ہی ہے

ایک وظیفہ خوار کہیں باہر گھومنے گئے ہوئے تھے اس لئے اپنے وظیفہ کی کارروائی میں وہ حیاتی وثیقہ داخل کر کے بقایا کی وصولی کے بھی مستدعی ہوئے۔ ان کا وثیقہ اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ اس تاریخ پر زندہ ہیں اور وصول طلب وظیفہ کی رقم کے حقدار۔ محکمۂ صدر محاسبی نے چالو وظیفہ تو اجرا کیا لیکن بقایا کے لئے اُن کو ہدایت دیگئی کہ وہ ایک اور سرٹیفکٹ پیش کریں کہ وہ پچھلے سال بھی زندہ تھے۔

پٹرول راشننگ کے زمانہ میں ایک عہدہ دار کو جن کے ذمہ نہایت ہی اہم کام تفویض تھے اپنے دفتر جانے آنے کیلئے پٹرول کے کوپن اجراء کئے گئے تو انہوں نے بتایا کہ اتنا پٹرول تو صرف یکطرفہ جانے یا آنے کے لئے ہی کافی ہو سکتا ہے تو انہیں بتایا گیا کہ وہ خود تصفیہ کر لیں کہ وہ اسکو جانے کیلئے استعمال کریں گے کہ آفس سے واپس آنے کے لئے۔

ایک افسر بازآبادکاری کے محکمہ میں بے گھر لوگوں کو بسانے کے کام پر معمور ہوئے۔ اپنی فطری کاہلی کی وجہ سے انھوں نے اپنے کام میں کچھ تیز رفتاری بتائی نہ ان بے سہارا لوگوں کے لئے تعمیری کام چالو کیا۔ تنقیح کنندہ حاکم نے موقعہ معائنہ کر کے ان سے فرائض مفوضہ میں کوتاہی کے بارے میں جواب طلب کیا۔ انہوں نے صرف اس قدر جواب لکھ کر بھیجا " بمقدمہ صدر بعنوان آبادکاری جواباً ترقیم ہے کہ بستی بسنا کھیل نہیں ہے۔ بستے بستے بستی ہے۔"

ایک پرانی اور ضخیم مثل میں مزید کارروائی کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔ تمام تصفیہ طلب امور پایہ تکمیل کو پہنچ چکے تھے، اس لوبت پر ماتحت اہلکار نے اپنے حاکم اعلیٰ کے پاس یہ تجویز رکھی کہ اس مثل کو داخل دفتر کر کے جلا دینے کی منظوری صادر فرمائی جائے۔ افسر نے بلا سوچے سمجھے حکم صادر فرمایا " مثل کو جلانے کی منظوری دی جاتی ہے بشرطیکہ مثل کے جملہ کاغذوں کے نقول محفوظ کر لئے جائیں۔"

ایک دفتر کی تنقیح ہو رہی تھی سوال کیا گیا کہ اس دفتر میں کتنے اہلکار صیغہ دار کام کرتے ہیں۔ جواب دیا گیا "دس میں ایک۔"

ایک دفتر کے لئے نئی عمارت کی تعمیر کا مسئلہ درپیش تھا۔ نقشے منظوری کے لئے مرتب ہوتے رہے۔ سرکاری "آرکیٹکٹ" نے ایک بہت ہی دیدہ زیب نقشہ تیار کیا لیکن اُس کا پیمانہ (اسکیل) بڑا رکھا اور بڑے بڑے نقشے تیار کر کے رکھے۔ عہدہ دار اعلیٰ نے تخمینہ کو دیکھا بھی نہیں اور ان نقشوں کو یکمشت نا منظور کر دیا کہ ہمیں اتنی بڑی عمارت نہیں بنانا ہے۔ نقشہ نویس اور انجنیئر پھر بٹھائے گئے اور حاکم اعلیٰ کی تنگ ذہنیت کو سمجھ کر انہیں تخمینوں پر وہی نقشے چھوٹے پیمانہ (اسکیل) پر چھوٹے چھوٹے کاغذوں پر تیار کئے گئے جو فوراً منظور کر لئے گئے۔

یہ بھی بالعموم دیکھا گیا کہ جب کبھی کوئی نئی اسکیم بنتی ہے تو اس کا تخمینہ ہر نوبت پر کاٹا چھانٹا جاتا ہے اس لئے اصل حساب سے بڑھ چڑھ کر رقم کا موازنہ پیش کیا جاتا ہے تاکہ کمی و بیشی کے بعد اتنا تو ملے کہ وہ اسکیم روبہ عمل لائی جا سکے۔ یا پھر کوئی درخواست گذار شادی یا تقریب کے سلسلے میں دس سیر شکر راشن سے بڑھ کر مانگے تو ڈیڑھ سیر کی منظوری صادر ہوا کرتی ہے۔ اسی مناسبت سے ایک صاحب نے عرضی دی کہ انہیں توپ خریدنے کا لائسنس

دیا جائے۔ پوچھا گیا کہ اس زمانہ میں توپ کا کیا کرو گے؟ انہوں نے بتایا "مجھے توپ تھوڑے ہی لینا ہے سوچا توپ مانگوں گا تو پستول کا لائسنس تو مل ہی جائے گا۔"

کسی آفس میں ایک نوجوان کو نوکری ملی چونکہ اس کا کوئی واقف کار تھا نہ دوست اور پھر وہ کسی سے ملتا جلتا بھی نہ تھا۔ اسکے متعلق چہ می گوئیاں ہونے لگیں اور سب کو یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ یہ کنوارا ہے یا شادی شدہ؟

ایک صاحب نے بڑے معلوماتی انداز میں کہا "وہ ہرگز شادی شدہ نہیں ہو سکتا وہ تو کنوارا ہے۔"

پوچھا گیا کہ "آپ یہ اس قدر وثوق سے کیسے فرما رہے ہیں؟" انہوں نے جواب دیا "بڑی سیدھی سی بات ہے ہر صبح وہ دفتر کو ایک نئے رخ سے اور مختلف راستوں سے آتا ہے۔"

کچھ دنوں بعد ایک گپ باز اور اسکینڈل اڑانے والی خاتون نے کہا کہ وہ تو آوارہ بھی ہے اور عیاش بھی۔ اور اس بات کی تصدیق میں یہ ثبوت پیش کیا کہ اس نوجوان کی موٹر راتوں میں شراب خانہ اور قحبہ خانہ کے سامنے کھڑی رہتی ہے۔ اتفاق سے یہ بات اس کے کانوں تک پہنچ گئی اس نے بدلہ لینے کی سوچا وہ ہر رات اپنی موٹر اس خاتون کے گھر کے سامنے کھڑی کر دیتا



یہ کچھ خاص مزاح کی بات تو نہیں البتہ دنیا نے اسکو پارکنسن
کے قانون کے نام سے مان لیا ہے۔ "کسی کام کی تکمیل کیلئے جو وقت
معین کیا جاتا ہے اسی مناسبت سے وہ کام از خود پھیل جاتا ہے"۔
اس کے ثبوت میں یہ محاورہ پیش کیا جاتا ہے کہ بے حد مصروف آدمی ہی
کے پاس زائد وقت نکل آتا ہے۔ اس مسئلہ کا اطلاق سرکاری دفاتر
کے کام پر اس طرح ہوتا ہے کہ چاہے کام بڑھے گھٹے یا بالکل مفقود ہو
جائے لیکن عہدہ داران سرکاری کی تعداد بڑھتی ہی رہتی ہے۔ اس کے
لئے دو مزید قوانین قدرت کارفرما نظر آئیں گے۔ (۱) ہر عہدہ دار اپنے
ماتحتین کی تعداد کو بڑھانا چاہے گا۔ (۲) عہدہ دار کام پیدا کرتے ہیں اپنے
اور سب کے لئے۔

ان مسائل کے تفصیلی ملاحظہ کے لئے تصور کیجئے ایک ایسے
عہدہ دار کا جو سمجھتا ہے کہ اس کے پاس کام بہت زیادہ ہے۔ یہ چاہے
صرف قیاس آرائی ہو کہ حقیقت بحث سے غیر متعلق ہے۔ اسپر بھی
ہمیں دھیان دینا ہے کہ یہ مفروضہ اس بات پر مبنی تو نہیں کہ عہدہ دار
موصوف کی توانیاں او جولانیاں اپنی پیرانہ سالی کی وجہ سے گر گئی ہیں۔

اب اس اہم ترین مسئلہ کے حسبِ ذیل حل ہو سکتے ہیں:
۱۔ عہدہ دار موصوف اپنی نوکری سے استعفیٰ دے دیں۔ (۲) اپنے برابر کے عہدہ دار سے اپنا کام بانٹ لیں۔ (۳) اپنے لئے دو مددگار مانگ لیں شائد تاریخ میں ایسی کوئی نظیر نہیں کہ جب کسی عہدہ دار نے پہلی دو تجاویز پر عمل کیا ہو۔ ظاہر ہے کہ ب اور ج دو معاون و مددگار ماتحت لینے ہی میں ہر طرح کی بھلائی ہے یہاں یہ بھی قابلِ تذکرہ ہے کہ ایک ہی مددگار لیا جائے تو عہدہ دار بالادست یعنی ا اور ب میں کام تقسیم ہو جائیگا۔ اور ظاہر ہے کہ نتیجتہً ا کی اہمیت گھٹ جائے گی اور آئندہ وہ ا کی جگہ کا حقدار ہو جائے گا اور جو ب اور ج دو یا اس سے بھی زیادہ ہوئے تو ایسے خدشے بالکل نہیں رہیں گے اور لطف یہ کہ ہر ایک ا کو خوش رکھ کر دوسرے پر فوقیت جتانے کی کوشش میں لگا رہے گا۔ اب وقت کے بیتنے اور کام کے بڑھتے بڑھتے اگر ب یا ج نے مناسب موقع پر اپنے کام کی زیادتی کا واویلا مچایا تو ا اس موقف میں ہوگا کہ دونوں کے لئے دو دو اور مددگار ح۔ ط۔ ھ اور "و" کا بندوبست کرے اس طرح پر ا کا عہدہ زیادہ ممیّز اور اس کی ترقی زیادہ مستحکم ہو جائے گی۔ اس طرح ایک کے ذمّے کام کو، ۷ عہدہ دار انجام دیتے ہوئے پائے جائینگے۔ اب ظاہر ہے کہ ان ساتوں نے مل کر کام کو بھی اتنا بڑھا لیا ہوگا کہ سب ہی بے حد مصروف ہوں گے اور ا پر نہ

صرف اپنے ابتدائی کام کا بوجھ اٹھائیگا بلکہ ان تمام کے وزن کا بھی وہ تنہا ذمہ دار افسر ہوگا۔ موصولہ مراسلہ بالفرض "ھ" کے پاس پیش ہوا۔ اس نے "د" کے سامنے رکھ دیا۔ د نے مسودہ تیار کیا اور ب کے ملاحظہ میں گزارا اس نے کچھ ردوبدل کر کے ج کی رائے کیلئے بھجوا دیا۔ اب ج کو بھی اپنے ماتحت سے کام لینا ہے اس نے ح کا مشورہ حاصل کرنا چاہا یہ اس وقت رخصت اتفاقی پر ہیں اسلیئے کچھ ردوقدح کے بعد ط کے پاس یہ مسودہ جائے گا جو مناسب اور ضروری ترمیم کے بعد پھر ج کے پاس سے ہو کر ب کے پاس آیا اور اس نے ا کے ملاحظہ گرامی میں رکھ دیا۔ اب بتایئے ا کو اتنی فرصت کہاں کہ اس کو تفصیل وار پڑھے۔ اس کو اپنے سے بالاتر عہدہ پر ترقی کی فکر اگر لاحق ہے تو یہ بھی وہ اپنی ذمہ داری محسوس کرتا ہے کہ ب یا ج کو اپنی صوابدید اور اپنے کرم سے اوپر لاتا ہے۔ ھ کو بھی چاہیئے د کو اضافہ تدریجی۔ اس کے علم میں یہ بھی بات آئی ہے کہ ط اپنے سکشن کی خاتون کارکن سے عشق فرما رہے ہیں حالانکہ وہ شادی شدہ ہیں ع اور غ کسی اور محکمہ میں ترقی یا جانے کیلئے کوشاں ہیں تو اب ان حالات میں ا اس مسودہ پر آنکھ میچ کر دستخط نہ کرے تو کیا کرے لیکن وہ بڑے فرض شناس اور باضمیر عہدہ دار ہیں اور ان کے اپنے تخلیق شدہ ماتحتین کی ان سب الجھنوں کے باوجود وہ اپنے کام سے

منہ نہیں موڑے۔ اور اس مسودے کو بغور پڑھا کر کانٹ چھانٹ کر کے ترمیم و اصلاح کرتے ہیں اور وہ بھی اس حد تک کہ تمام ماتحتین کی سعی و کاوش ختم ہو جاتی ہے۔ طرز تحریر کی بھی درستگی ہو جاتی ہے معانی و مافیہ الضمیر بھی بدل جاتے ہیں ہر ایک نے اپنا فرض پورا کیا ہے۔ کسی نے تساہلی نہیں برتی اور جو انہے تیار کیا ہے وہ ان سارے ماتحتین کے نہ ہوتے ہوئے بھی یہی کچھ کر سکتا تھا۔

ابھی اس پارکنسن کے قانون پر بہت کچھ دماغ پاشی کی جا سکتی ہے لیکن ہماری کتاب کا موضوع الگ ہے اس لیئے دفتریت کے اس دلچسپ پہلو پر اس مسئلہ کو ختم کرتے ہیں۔



لطیفہ کی صنف کی جو میں نے وضاحت کی ہے اس کی مناسبت سے کچھ ایسے واقعات بھی پیش ہیں کہ جن کو سن کر حسِ لطیف اجاگر ہو جاتی ہے گو ہنسی نہیں پھوٹتی لیکن جسم و جان میں وہ گدگدی ضرور پیدا ہو جاتی ہے کہ جو دل و دماغ میں انبساط کی لہر دوڑا دیتی ہے۔ بزرگوں کے چند ایسے قصّے قلم بند کیے جاتے ہیں۔

حضرت عبدالقادر جیلانی رح کے متعلق روایت ہے کہ وہ ایکبار کسی جید عالم کی شہرت سُن کر اکتساب اور حصولِ علم کی خاطر ان کے حضور میں تشریف لے گئے۔ جب یہ بزرگ کے در پر پہنچے تو دیکھا کہ وہ اپنے گھوڑے کو بلانے کیلئے اس کے دانہ کا خالی توبرا دکھا کر پچکار رہے ہیں۔ یہ الٹے پاؤں واپس ہو گئے کہ جو شخص اپنے علم کے باوجود اپنے عمل میں جانوروں تک سے دھوکہ دہی میں گریز نہیں کرتا تو اسکا علم فضول اور بے کار ہے۔

ایک بار کسی مسجد کے قریب ہی ندی کنارے درخت کی ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں میں شیطان نے اپنا اڈا جمایا اور جب کبھی اذان ہوتی اور لوگ مسجد جانے کی تیاری کرتے۔ شیطان ان کو بھٹکا کر اپنے

اڈے پر لانا اور اس ماحول میں ان پر ایسی کاہلی اور سستی طاری ہوتی کہ یہ نماز وغیرہ بھول کر آرام کرنے لگتے۔ یہ سلسلہ مدتوں چلتا رہا۔ مسجد کے امام کو برا لگتا اور یہ ہمیشہ شیطان کو اپنی شرارت سے باز آنے کی ہدایت کرتے مگر جسکا کام ہی اچھے بھلے آدمیوں کو بھٹکانا ہو وہ کیوں ماننے لگا۔ شرارت حد سے گذری اور مسجد ویران ہو چلی تو امام کو اسکے سوا کوئی چارہ نظر نہ آیا کہ شیطان کے ساتھ سختی سے پیش آئیں۔

ایک دن انہوں نے اس کی خوب پٹائی کی حتیٰ کہ وہ اپنی چوکڑی بھول گیا اور اپنی ہار مان لی۔ لیکن ہارتے ہارتے بھی اس نے ایک اور چال چلی۔ امام صاحب کو لالچ دینے لگا کہ وہ ان کو روزانہ سوا شرفیاں بطور نذرانہ پیش کرے گا بشرطیکہ امام صاحب شیطان کی شرارتوں کو نظر انداز کر دیں۔ بے چارے امام کی یوں بھی فاقوں پر گذر بسر ہوتی طمع نے مجبور کیا اور وہ راضی ہو گئے۔ کچھ دنوں تک تو ان کا نذرانہ ملتا رہا پھر شیطان نے ایکدم بند کر دیا۔ اب یہ مانگتے تو ان کو ٹکا سا جواب دیدیتا اور جو زیادہ اصرار سے مانگنے لگے تو ان کے ساتھ ذلت کا برتاؤ کرنے لگا۔ طیش میں امام نے ایک دن پھر اسکو پکڑا اور پٹائی کرنا چاہا لیکن اس بار اُن کی ایک بھی نہ چلی، شیطان ان کے بس میں آتا ہی نہ تھا بلکہ الٹا ان ہی کی گندی کر دی۔ جب یہ ہار گئے تو عاجزی سے پوچھا کہ یہ کایا پلٹ کیسی۔ یا تو میں تم پر اتنا حاوی تھا اور آج یہ عالم بے بسی ہے۔

شیطان نے کہا۔ "جناب والا پہلے موقعہ پر آپ ایمان کے جوش میں تھے، اور وہی جذبہ کارگر تھا۔ اب تو آپ حرص و ہوس کے بندے ہیں، ایسی صورت میں آپ کی مجھ پر کیا چلے گی"۔

نوشیروان عادل نے ایک بار ایک معمّر آدمی کو جھاڑ کے بیج بوتے دیکھا تو انھوں نے سوال کیا "بڑے حضرت آپ یہ زحمت کیوں کر رہے ہیں اس کا پھل کھانے کو تو آپ زندہ نہیں رہیں گے!" اس بوڑھے نے جواب دیا "تقصیر آج جن درختوں کے پھل آپ ہم کھا رہے ہیں وہ بھی تو کسی اور نے اپنے زمانہ میں لگائے ہوں گے اور وہ تو آج نہیں ہیں"۔
نوشیروان عادل کو یہ بات بہت پسند آئی اور اس نے بہت سارا انعام دیا۔ اس پر اس بوڑھے نے کہا "حضور لیجئے ان کا پھل تو مجھے اب ہی مل گیا"۔ نوشیروان عادل کو یہ بات اور بھی پسند آئی اس نے مزید انعام سے سرفراز کیا۔ اس پر یہ پھر گویا ہوا۔ "اور بھی ملاحظ فرمائیے عالیجاہ؟ اس درخت کے بیج نے تو ابھی کے ابھی دو بارہ پھل دیدئیے"۔ اس برجستگی پر اسکو دوبارہ انعام دیا گیا۔

خلیفہ ہارون الرشید گرمی کے موسم میں ایکبار بہت پیاسے ہو گئے اور جو مشکل سے پانی دستیاب ہوا تو بہت سیر ہو کر پی گئے۔ خدا کا شکر ادا کیا اور خود ہی کہنے لگے "اس پیاس کے عالم میں پانی کے لئے مجھ سے کوئی میری سلطنت مانگ لیتا تو بے دریغ ا

دے دیا ہوتا۔"

ابن السماب ساتھ میں تھے انہوں نے دریافت کیا" اعلیٰ حضرت اگر خدانخواستہ آپ کا پیشاب رک جائے تو اس کی تکلیف کم کرنے کو بھی اسی طرح اپنی سلطنت دان کر دیں گے؟"

خلیفہ ہارون الرشید نے جواب دیا" بے شک بے شک۔"

اس پر ابن السماب نے کہا" تب تو حضور والا اس سلطنت کی قیمت چند قطرہ ہائے آب اور ایک قطرۂ پیشاب سے کچھ زیادہ نہیں!"

کہتے ہیں کہ ابن خلدون کے پاس بہت ہی خوبصورت اور بڑی ہی عمدہ نسل کا گھوڑا تھا جس کو وہ جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ دوست اور دشمن سبھی کی اس گھوڑے پر نظر تھی بڑی سے بڑی قیمت اور لالچ ان کو دی گئی کہ وہ اس کو بیچنے پر راضی ہو جائیں مگر یہ کسی طرح راضی نہ ہوتے تھے۔ شہسواری اور طاقت میں یہ کسی سے کم نہیں تھے اور ان پر غلبہ پانا ناممکن محض تھا۔

ایک بار کچھ خبیثوں نے سازش کی کہ کسی طرح دھوکہ دے کر اس گھوڑے کو ہتھیانا چاہیے۔ چنانچہ ایک ویران راستہ پر کہ جہاں سے یہ گذرنے والے تھے ان میں سے ایک ادھ موا بیمار سا پڑ گیا۔ اور جب یہ پاس سے گذرنے لگے تو بری طرح کراہنے اور مدد کے لئے چلاّنے لگا۔ یہ ہمدردی میں اپنے گھوڑے سے

اُتر پڑے اور اس کو سہارا دے کر اپنے گھوڑے پر سوار کرا یا اور ساتھ ساتھ پیدل چلنے لگے۔ یہ موقعہ خوب تھا اس بدمعاش نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور بھگا کر نکل جانا چاہا۔ ابن خلدوں نے اس سازش اور دھوکے کو سمجھ کر چلا کر کہا "گھوڑا لے جاتے ہو تو لے جاؤ لیکن کسی کو یہ ہرگز نہ بتانا کہ تم نے اس طرح دھوکہ دے کر گھوڑا حاصل کیا۔ ورنہ تمہاری کوئی عزت نہ ہوگی، میری طرف سے اجازت ہے کہہ دینا کہ میں نے خود تمہیں دیا ہے"۔

فریب دے کر لے جانے والا شریف اور قدرشناس تھا یہ ایثار اور شرافت دیکھ کر اس سے گھوڑا لے جایا نہ گیا واپس آیا اور گھوڑا لوٹا دیا۔

ایک رئیس اپنی ساری جمع پونجی ہیرے اور جواہرات کے پاس بیٹھے بیٹھے کڑھا کرتے اور ہر ایک سے شکایت کیا کرتے کہ یہ ساری دولت مجھے خوشی نہیں بخشتی بس ہمیشہ اسی اُدھیڑ بن میں رہتا ہوں۔ یہ سنکر ایک دن اُن کے دوست سعید کو یہ تجویز سوجھی۔ وہ جھپٹا مار کر اُن کے سارے قیمتی زیورات اور دولت کی گٹھڑی لے بھاگے۔ یہ رئیس کہاں چھوڑنے والے یہ بھی تعاقب میں چل پڑے بھاگتے بھاگتے بہت دور نکل گئے تو دوست نے اس گٹھڑی کو سڑک پر پھینک دیا اور درخت کے پیچھے چھپ گئے۔ یہ رئیس ہانپتے کانپتے

بے دم حواس باختہ پہنچے اور عین سڑک پر اپنی دولت اور ہیرے جواہرات کو دیکھ کر خوشی سے پاگل ہو گئے۔ چیخ چیخ کر اپنی خوشی کا اظہار کرنے لگے۔ اس پرائی کے دوست نے پوچھا "اب تک یہی دولت آپ کے ہاتھ میں تھی تو آپ کو کچھ خوشی اس سے ملتی نہ تھی اور اب یہی کچھ دیر کے لئے آپ سے جدا ہو کر واپس ملی ہے تو آپ کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں۔ کیا وہ خوشی جسکو آپ کو جستجو تھی اس دولت میں پنہاں ہے یا اس کے گم ہو کر مل جانے میں؟"



اعلیٰ ترین مزاح وہ ہے کہ جو دوست اور دشمن ہر ایک کو لطف اندوز کرے۔ اور کسی کے دل کو ٹھیس نہ لگاتے ہوئے اُن پُر سرور جذبات کو ابھارے کہ جو زندگی کا ماحصل کہلا سکتے ہیں۔ آنجہانی جے ایف کینڈی کے واقعاتِ زندگی اِس قسم کے مزاح سے بھرے پڑے ہیں امریکہ کے صدارتی انتخابات کے زمانہ میں اُن کے حریف نکسن بیمار ہو کر ہسپتال میں فریش ہو گئے تو کینڈی نے بطور خود اعلان کیا کہ ان کی بیماری کے دوران اُن کے خلاف کچھ نہیں کہیں گے؛ اِلّا اِس کے کہ ان کی تعریف کا کوئی موقع ہو۔ ایک طرح سے عوام الناس پر اِس کا بڑا اچّھا اثر پڑا۔ کچھ دنوں بعد اخبار والوں نے استفسار کیا کہ یہ خود ساختہ پابندی کب تک رہیگی۔ کینڈی نے کہا "میں کہہ چکا ہوں کہ جب تک نکسن ہسپتال میں ہیں اُن کا نام بھی زبان پر نہیں لاؤں گا جب تک کہ اُن کی تعریف و سراہنے کی کوئی بات نہ ہو' اور میں نے اب تک تو نام لیا ہی نہیں۔"

اپنے سیاسی کیریر کے ابتدائی انتخابات کے زمانہ میں ہی کینڈی ایک بار کسی محفل میں دیر سے پہنچے اور معافی چاہتے ہوئے کہا "مجھے شاید

اور بھی دیر ہو جاتی لیکن ایک بڑے اچھے ٹیکسی ڈرائیور کی مدد سے میں بہت تیز رفتاری سے چلا آیا۔ میرا تو خیال تھا کہ اس خوشی میں ٹیکسی ڈرائیور کو بڑی سی بخشش عطا کروں اور اپنی ڈیموکریٹک پارٹی کو ووٹ دینے کے لئے کہوں لیکن مجھے اپنے ایک اور دوست کی بات یاد آ گئی جس پر میں نے اس ڈرائیور کو ایک سنٹ بھی ٹپ نہیں دی اور اس کو یہ کہتا ہوا چلا آیا کہ وہ براہ مہربانی ری پبلکن پارٹی کو ووٹ دے"

اسکے بیان کی چنداں ضرورت نہیں کہ اس کا ردِ عمل کیا ہوا ہوگا اور ڈرائیور نے ڈیموکریٹک پارٹی کو بہتر سمجھ کر ووٹ دینے کا ضرور فیصلہ کیا ہوگا۔

ویسے تو کینیڈی کی زندگی اس قسم کے لطائف و واقعات سے بھری پڑی ہے مگر دیگر مدبرین و سیاس کے اقوال و افعال میں بھی ایسے مزاح کی چاشنی بطور وافر ملتی ہے۔

برطانیہ کے سفارتی حلقہ احباب میں اس بات پر خوب چرچا ہو رہا تھا کہ "چرچل مُردہ باد" کہنے پر ایک برطانوی باشندہ کو بڑی سخت سزا دیگئی بالخصوص روسی سفیر نے حقارت سے کہا کہ انگریز قوم بڑی ظالم اور جابر ہے کہ جہاں اتنی معمولی سی بات پر ایسا خراب برتاؤ کیا جاتا ہے اسپر کسی نے روسی سفیر سے استفسار کیا "آپ کے ملک میں اگر ایسا واقعہ ہوتا تو کیا سزا دیجاتی؟" روسی سفیر نے بڑی خندہ پیشانی سے کہا۔

"روس میں کسی نے "چرچل مردہ باد" کا نعرہ لگایا ہوتا تو اسے ہرگز کوئی سزا نہ دیجاتی۔"

مسٹر کرشچیف خود اپنے متعلق یہ قصہ بڑا مزہ لے کر سنایا کرتے کہ ایک روسی باشندہ کو اس الزام میں گرفتار کیا گیا کہ اس نے کریملن کی سڑکوں پر یہ نعرہ لگایا "کرشچیف بے وقوف ہے۔ کرشچیف بے وقوف ہے"۔ اس جرم پر مقدمہ چلا کر اس کو ۲۳ سال کی قید بامشقّت کی سزا دیگئی۔ تین سال کی سزا اس پاداش میں کہ اس نے روسی پارٹی کے معتمد کی بے عزّتی کی اور ۲۰ سال اس لیئے کہ اس نے ایک ریاستی راز کو سربازار آشکارا کردیا۔

مسٹر ونسٹن چرچل کی ۸۲ ویں سالگرہ کے موقعہ پر ان کی بہت ساری تصویریں لیتے ہوئے ایک نوجوان فوٹوگرافر نے ان کو تہنیت پیش کی اور یہ تمنّا کی کہ ان کی ۱۰۰ ویں سالگرہ پر بھی وہ مبارکباد دینے اور تصاویر لینے حاضر رہے۔ چرچل نے مبارکباد قبول کرتے ہوئے کہا "کیوں نہیں، کیوں نہیں تم تو ابھی نوجوان ہو اپنی صحت کا خیال رکھوگے تو ضرور ہماری ۱۰۰ ویں سالگرہ پر موجود رہ سکوگے!"

امریکہ کے صدر ابراہام لنکن نے کسی رئیس انگریز سے کہا کہ انگلستان میں جنٹلمین اپنے جوتوں کو خود پالش نہیں لگاتے، اس پر لنکن نے دریافت کیا "تو پھر وہ کس کے جوتوں کو پالش لگاتے ہیں؟"

ایک معمر خاتون نے ابراہام لنکن کو بتایا کہ اس کا شوہر جنگ آزادی میں اپنی جان کی قربانی دے چکا ہے۔ خود اسکے اپنے باپ نے نیو اورلینس کی جنگ میں اپنی بہادری کے جوہر دکھائے ہیں۔ اسکے دادا نے لیکزنگٹن کی لڑائی میں نام کمایا ہے۔ اور پھر اس خاتون نے اپنے لڑکے کیلئے فوج کی نوکری کا مطالبہ کیا۔ بطور واجبی حق نہ کہ کسی احسان کی طرح۔ لنکن نے ٹالنے کو کہا "خاتون محترم بے شک آپکے خاندان کے بہت سارے افراد نے کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں لیکن اب اوروں کو بھی تو موقع ملنا چاہئے۔"

دوران جنگ میں برطانیہ سے مسٹر ونسٹن چرچل ایک مختصر سی میٹنگ کے لئے امریکہ گئے اور مسٹر روزولٹ کے مہمان خصوصی ہے۔ صبح صبح یہ نہا کر جسم پوچھ رہے تھے کہ روزولٹ اپنی کرسی کو گھماتے ہوئے ان کی خواب گاہ میں پہنچ گئے اور یہ دیکھ کر کہ مسٹر چرچل نے ابھی کپڑے نہیں پہنے ہیں واپس ہوا چاہتے تھے۔ مسٹر چرچل کی تطر پڑی تو پکار کر کہا "مسٹر روزولٹ آپ کو واپس جانے کی ضرورت نہیں، برطانیہ امریکہ سے کچھ بھی پوشیدہ یا ڈھکا چھپا نہیں رکھنا چاہتا ہے۔"

ڈاکٹر جانسن انگریزی زبان کے نہ صرف بڑے بھاری ادیب تھے بلکہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ زبان اُن کی محکوم ہے اس سے وہ جس قسم کے بھی معانی و مطالب چاہتے نکالتے اور لوگوں کو محظوظ کرتے۔

ڈاکٹر جانسن کی مشہور و معروف انگریزی لغت کے متعلق کسی خاتون نے شکایتاً کہا کہ اس میں بہت سارے مخرب اخلاق الفاظ بھی شریک ہیں۔ اس پر ڈاکٹر جانسن نے کہا "خاتون محترم جو ئندہ یابندہ جو ڈھونڈھتا ہے وہی اسکو ملتا ہے"۔

امریکہ کے صدر کولرج، کلیسا سے اپنی قیامگاہ وائٹ ہاوز لوٹے تو ان کی بیوی نے پوچھا "آج کا وعظ کیسا تھا؟"

"بہت اچھا" انہوں نے جواب دیا۔ "موضوع کیا تھا؟"

"گناہ"۔ "اس موضوع پر پادری صاحب نے کیا کہا؟"

"انہوں نے اسکی سخت مخالفت کی"۔

کسی امریکن نے کپلنگ کو خط لکھا "میں نے سنا ہے کہ آپ اپنے ادبی شاہ پاروں کو فی لفظ ایک ڈالر کے حساب سے فروخت کرتے ہیں۔ اس لئے ذریعۂ ہذا ایک ڈالر مرسل ہے، براہ کرم نمونہ روانہ فرمائیے"۔ کپلنگ نے ڈالر رکھ لیا اور صرف ایک لفظ "شکریہ" لکھ کر بھجوا دیا۔ دو ہفتہ بعد امریکن نے پھر لکھا۔ "آپ کے شکریہ والے کاغذ کو دو ڈالر میں فروخت کیا اور منافع کا ۵۰ فی صدی یعنی آدھا ڈالر روانہ ہے"۔

جارج برنارڈ شاہ کو بھی زبان پر بڑا ملکہ تھا اور وہ اپنے فطری احساسِ مزاح سے ایسے حسین نکات پیدا کرتے کہ لوگ عش

عش کرتے رہ جاتے۔

غیر معمولی حسین اور مشہور عالم رقاصہ (اسا ڈورا ڈنکن) نے جارج برنارڈ شاہ کے سامنے شادی کی تجویز رکھی اور کہا "جو ہماری اولاد ہوگی تو وہ میرے حسن اور آپ کی ذہانت اور ادبی صلاحیتوں سے مالا مال ہوگی"۔ برنارڈ شاہ نے کہا "آپ کی اس نوازش سے میں فخر محسوس کرتا ہوں لیکن اگر اسے میری شکل صورت ملی اور آپ کا دماغ تو کیا قیامت ہو جائے گی"۔

کسی محفل میں گرما گرم بحث ہو رہی تھی ایک صاحب نے کہا "مجھے افسوس ہے کہ یہاں پر نصف سے زیادہ لوگ جھوٹے ہیں"۔

اس پر بڑا ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ سبھوں نے برا مان کر ان سے اپنا بیان واپس لینے کے لئے اصرار کیا۔ یہ بخوشی راضی ہو گئے اور کہا "میں بڑی خوشی کے ساتھ اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں بے شک یہاں پر نصف سے زیادہ لوگ جھوٹے نہیں ہیں"۔



ہمارے ایک دوست کو راجیہ سبھا کی رکنیت کا وعدہ کیا گیا تو انہوں نے خوشی خوشی ٹیلیفون اُٹھا کر بیوی سے دریافت کیا "تم ایم پی کی بیوی بننا پسند کرو گی؟" بیوی نے پوچھا "کس ایم پی کی؟" انہوں نے اتنے مختصر جواب کے بعد خود ایم پی بننے کا پھر کبھی خواب بھی نہ دیکھا۔

میونسپل چناؤ کے ایک امیدوار سے پوچھا گیا کہ اگر وہ کونسلر (رکنِ بلدیہ) منتخب ہو جائینگے تو کیا کریں گے۔ اُمیدوار نے کہا "مجھے اِس بات کی کچھ زیادہ فکر نہیں اصل فکر جو مجھے دامن گیر ہے وہ یہ ہے کہ اگر چناؤ میں ناکام رہا تو کیا کروں گا۔"

وہ جو اپنی پارٹی (جماعت) چھوڑ کر مخالف گروپ میں جا ملتا ہے غدار کہلاتا ہے۔ اور جو مخالف گروپ سے ہماری پارٹی میں آملتا ہے وہ CONVERT کنورٹ کہلاتا ہے۔

ایک ابھرتے سیاسی لیڈر اپنی شہرت اور ناموری کے بہت جویا تھے۔ اپنی ہر دل عزیزی اور مقبولیت کے لئے ہر موقعہ سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے۔ ایک پبلک میٹنگ میں اُن کو پھولوں کے ہار

اور گلدستے بڑی تعداد میں پیش کئے جا رہے تھے اور جب یہ سلسلہ ختم ہو گیا اور تقاریر کی نوبت آئی تو یہ ناراض سے دکھائی دے رہے تھے۔ اُن کے قریبی دوست نے سرگوشی میں وجہ پوچھی تو یہ بھڑک اٹھے منتظمین اور کارکنانِ جلسہ کو صلواتیں سناتے ہوئے کہنے لگے:

"اِن لوگوں نے بڑا اچھا لُٹا دیا مجھ سے پھولوں کے سو ہاروں کے پیسے بٹور لئے اور یہاں صرف ۷۵ ہار ہی پیش کئے ہیں۔ فریبی۔ جھوٹے کہیں کے"۔



عُریاں قسم کے لطیفے بڑی سنجیدہ قسم کی محفلوں میں بھی بہت مقبول ہوتے ہیں لیکن اکثر و بیشتر اُن پر مہین پردہ ڈال کر الفاظ کی گندگی سے بچا کر بھی اچھے قسم کا مزاح پیدا کیا جا سکتا ہے اسی طرح جنسیات اور صنفیات سے متعلق لطیفے کہے سنے نہ جائیں تو لطیفہ گوئی کا دور مکمل نہیں ہوتا۔

بڑھتی ہوئی مہنگائی میں بچت یوجنا ناممکن ہوتی جا رہی تھی تو ایک میاں بیوی نے آپس میں طے کیا کہ جب کبھی شوہر بیوی کو پیار کرے تو ایک ڈبہ میں پانچ روپیہ کی نوٹ ڈال دے۔ اس طرح دن اور مہینے بیتتے گئے سال کے ختم پر ڈبہ کھولا گیا تو نوٹوں سے بھرا پڑا تھا مگر اسکے علاوہ ۱۰ کے نوٹ بھی تھے اور ۱۰۰ کے بھی۔ شوہر نے تعجب سے پوچھا کہ یہ سب کہاں سے آ گئے۔ بیوی نے کہا "تم سمجھتے ہو کہ سب ہی لوگ تم جیسے کنجوس ہیں۔"

ایک اور لطیفہ سنئے کہ ایک لڑکی اور ایک لڑکے میں بیحد محبّت تھی ایک دوسرے کو محبت بھرے خطوط لکھے جاتے تھے تحفے تحائف دیئے جاتے۔ محبّت کی پینگیں بڑھتی رہیں۔ اتفاق کی بات کہ لڑکی ایک حادثہ

سے دوچار ہوئی خون بہہ گیا اور اس عالم میں ڈاکٹر والے نے لڑکی کے جسم میں خون دینے کی تجویز کی لڑکے کا خون موزوں نکلا اور فوراً ہی خون دے دیا گیا۔ کچھ دنوں میں لڑکی بھلی چنگی ہو گئی۔ وقت کی بات ہے کسی وجہ سے عشق و محبت میں سردی آگئی۔ اور ایک دن سخت لڑائی بھی ہو گئی طیش میں دونوں نے ایک دوسرے کے تحفے لوٹا دیئے۔ لڑکی نے کہا "تمہارے دیئے ہوئے سارے تحفے واپس ہیں البتہ جو خون تم نے دیا تھا اسکو میں یکمشت تو نہیں واپس کر سکتی مگر ماہواری اقساط میں ضرور لوٹا دوں گی"۔

خاندانی منصوبہ بندی (فیملی پلاننگ) کا چرچا سنکر ایک صاحب ڈاکٹر کے پاس گئے اور ان سے مشورہ چاہا کہ اولاد نہ ہونے کے لیے کیا کیا جائے۔ ڈاکٹر نے ایک تجویز رکھی۔ انہوں نے کہا اس پر عمل تو کیا تھا لیکن پھر بھی اشوک پیدا ہو گیا۔ ڈاکٹر نے دوسری تدبیر بتائی تو کہا کہ وہ بھی کر کے دیکھ لیا پھر بھی منوج پیدا ہوا۔ ڈاکٹر نے کچھ اور تدبیریں بتائیں اور یہ ہر بار یہی کہتے رہے کہ وہ بھی کر کے دیکھا لیا پھر بھی دلیپ اور رنجنا پیدا ہوئے۔ تب تو ڈاکٹر نے کہا "جناب اب تو ایک ہی صورت ہے کہ آپ بیوی سے دور الگ رہیئے گا" ان حضرت نے کہا: "ڈاکٹر صاحب وہ بھی تو کر کے دیکھ لیا اس پر بھی رادھا نے جنم لے لیا"

امراض نسوانی کے ماہر ڈاکٹر نے کسی خاتون کی نسوانی بیماری کے

پیش نظر تجویز کی کہ اسکو اپنے شوہر سے کچھ دنوں الگ رہنا چاہیئے اور یوں ہی دریافت کیا "ایسا کر سکیں گی آپ؟" خاتون نے کہا "بسر و چشم ڈاکٹر صاحب میرا ایک بوائے فرینڈ بھی ہے"۔

کسی نائٹ کلب میں ایک صاحب تنہا پہنچے تو دو چار حسین لڑکیوں نے گھیر لیا اور اُن کے ساتھ وقت گذاری کے لئے ہر ایک نے ۵۰ ڈالر مانگے انھوں نے ۱۰ ڈالر پر بات طے کرنا چاہی لیکن بات بنی نہیں اور یہ واپس ہو گئے۔ دوسری رات یہ اتفاق سے اپنی بیوی کے ساتھ کلب پہنچے۔ لڑکیوں نے اُن کو پہچان کر کہا "یہ دیکھئے جناب ۱۰ ڈالر میں آپ کی صحبت میں کس معیار کی عورت ہو سکتی ہے"۔

شراب و کباب کی محفل صبح صبح تک گرم رہی اسکے بعد میزبان میاں اور بیوی دوپہر تک سوتے رہے۔ شام کی چائے پر کچھ ہوش و حواس ٹھکانے لگے تو میاں نے بیوی سے استفسار کیا "کیا رات کو اندھیرے میں میں نے لائبریری کے اندر تم سے محبت کی تھی؟"

بیوی نے اُلٹا سوال کیا "کتنے بجے رات کی بات پوچھ رہے ہو؟"

آصف نے ارشد کو بتایا کہ آج کل وہ اپنی بیوی کو دل بھر کے خوش نہیں کر سکتا جسکی وجہ سے ہر رات حیرانی پریشانی بلکہ پشیمانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ارشد نے کہا "دوست تم بالکل فکر نہ کرو رات

کے بارہ بجے کمرہ کو اندھیرا کردو۔ بستر پر پھول بکھیر دو۔ بیوی سے کہہ دو کہ وہ شبِ خوابی کا مہین ترین لباس پہن رکھے اور باہر کا دریچہ کھلا چھوڑ دو۔"

آصف نے پوچھا "اسکے بعد؟"

ارشد نے کہا "اسکے بعد صرف ایک ہلکی سی سیٹی بجا کر تم دوسرے کمرے میں چلے جانا اور باقی باتیں مجھ پر چھوڑ دینا"

دُور دُور کے مغربی ممالک سے واپسی پر بیگم صاحبہ نے ہم سے بہت ساری باتیں پوچھیں۔ درمیان میں سوال اٹھا "مصر کی عورتیں کیا کپڑے پہنتی ہیں؟ مطلب یہ کہ کیا وہ اپنی وضع سے ساڑی چولی، شلوار قمیص زیب تن کرتی ہیں یا فراک چڈی پہنتی ہیں؟"

"ارے وہ فراک پہنتی ہیں مگر اس کے ساتھ چڈی پہنتی ہیں کہ نہیں یہ تو ہمیں نہیں معلوم"

کسی پرانی وضع کی بڑھیا نے ایک شوخ و چنچل لڑکی کے حد سے زیادہ عُریاں اور برہنگی والے کپڑے دیکھ کر اعتراضاً دتا دیا کہا:

"تمہاری والدہ تمہیں ان شرمناک کپڑوں میں دیکھیں گی تو کیا کہیں گی؟" لڑکی نے جواب دیا "اوہ۔ وہ کہیں گی کہ فوراً ان کپڑوں کو اتار دو۔ اسلیئے کہ یہ ان ہی کے ہیں"

سائی کیاٹرسٹ ڈاکٹر نے طبّی تحقیقات کے وقت مریض کے سامنے ایک گول دائرہ بنا کر پوچھا "اِسکے دیکھنے پر کس بات کا خیال

آتا ہے آپ کو؟" مریض نے کہا "جنسی تعلقات"
ڈاکٹر نے ایک مربع بنا کر اپنا سوال دہرایا۔ مریض کا وہی جواب تھا
"جنسی تعلقات"
پھر ڈاکٹر نے مثلث بنا کر وہی سوال کیا۔ مریض نے ایکبار پھر وہی
جواب دہرایا۔
ڈاکٹر نے پوچھا "تو کیا آپ جنسی تعلقات کے سوا اور کچھ سوچ
ہی نہیں سکتے؟"
مریض برافروختہ ہو کر کہا "ڈاکٹر صاحب آپ بھی تو ان گندی
اور فحش تصویروں کے سوا اور کچھ کہتے سنتے ہی نہیں۔"
ایک فرم کے مالک نے اپنے آفس کی پندرھویں منزل
سے کود کر خودکشی کرلی۔ تحقیقات کے دوران پولیس نے اس کی سکریٹری
سے بہت سارے سوالات کئے اور سبب معلوم کرنے کی کوشش کی۔
لڑکی نے کہا "میں کچھ وجہ تو بتا نہیں سکتی البتہ یہ کہہ سکتی ہوں کہ جس دن
سے میں یہاں آئی ہوں وہ بہت مہربان تھے۔ مجھے اچھے اچھے کپڑے
لے کر دیئے۔ مجھے ایک فلیٹ بھی دلوایا۔ ایک بڑھیا انگوٹھی بھی لے کر دی
اور پھر کل پوچھا کہ اگر وہ مجھ سے محبت کرنا چاہیں تو میں ان سے کتنے روپے
لوں گی۔ میں نے بتایا کہ ویسے تو آفس کے دوسرے عہدہ داروں سے میں
۱۰۰ روپے لیتی ہوں لیکن ان سے ۵۰ روپیوں پر راضی ہوں۔ بس یہ سنتے ہی

وہ کھڑکی سے کود پڑے"۔

ایک بہت بڑا تاجر اپنی دکانوں کیلئے سامان کی خریداری کے سلسلے میں پردیس گیا ہوا تھا اپنی بیوی کے نام ہر ہفتہ دو ہفتہ کو تار بھیج دیتا کہ میں ابھی خریداری میں مصروف ہوں۔ مہینوں کے انتظار کے بعد شوہر کے کاروبار پر شک کرتے ہوئے بیوی نے بھی ایک تار دیا "مناسب یہ ہے کہ جلد واپس آجاؤ تم جس چیز کی خریداری کر رہے ہو میں اُسی کو بیچ رہی ہوں"۔

ہمارے ایک نوجوان شکاری دوست سال میں ایکمرتبہ بستر کے گھنے جنگل میں دور کہیں تن تنہا چلے جاتے ہیں کہ جہاں پر انہوں نے ایک چھوٹی سی جھونپڑی بنا رکھی ہے یہاں پر نہ تو اُن کے ساتھ گھڑی ہوتی ہے نہ جنتری نہ کسی سے مراسلت اور نہ کوئی آتا جاتا ہے بس ایک قبائلی عورت ان کو کھانا بنا کر دے جاتی ہے یہ اسی طرح دنیا کے شور و شغب سے دور بے فکر و بے پرواہ پڑے رہتے ہیں ہم نے پوچھا کہ پھر یہ کب اور کس وقت طے کرتے ہو کہ واپسی کا وقت آگیا ہے۔ انہوں نے کہا "جب وہ ادھیڑ عمر کی قبائلی عورت قبول صورت دکھنے لگتی ہے تو فوراً لوٹ آتا ہوں"۔

برہنولک کے سب سے بڑے کلب میں مقامی راجیہ پال کو مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے دعوت دی گئی اور جب بہ وقت مقررہ

کلب پہنچے تو انہوں نے سوچا برہنوں کے کلب میں ظاہر ہے کہ سب ہی ننگے ہوں گے۔ اور اُن کے بیچ یہ کپڑوں میں ملبوس کچھ عجیب عجیب سے لگیں گے اسلئے کلب کے باغ میں موٹر روک کر انہوں نے سارے کپڑے اتار دیئے اور کلب میں برہنہ داخل ہوئے۔ تمام ممبرانِ کلب نے مہمانِ خصوصی کے خیال سے اسی دن کپڑے پہن رکھے تھے اور راجیہ پال تن تنہا ہی برہنہ تھے۔ میزبان اور مہمان دونوں کی ہی حیرانی کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔

ننگوں کے کلب میں دیوار کے سوراخ سے دو کم عمر بچے جھانکنے کی کوشش کر رہے تھے ایک آنکھ لگائے دیکھ رہا تھا دوسرے نے پوچھا "بتا دے یار اندر کون کون ہیں مرد عورتیں سب ہی ہیں کیا؟" دوسرے نے جواب دیا" صبر کر دے یار کچھ سمجھ نہیں پڑتا کہ کون عورت ہے اور کون مرد۔ سب ہی تو برہنہ ہیں، کچھ کپڑے ہوتے جسم پر تو معلوم پڑتا کہ کون مرد ہے اور کون عورت۔"

دُنیا بھر کی عورتیں ایک زمانہ سے اسی ناانصافی کے خلاف آواز اٹھانا چاہتی تھیں کہ زنا شوئی کے برابری کے تعلقات کے باوجود اولاد پیدا کرنے کا بوجھا اور اس کی ساری جسمانی تکلیف کے کیلئے وہی ذمہ دار قرار دے دی گئی ہیں اور مردوں کے حق میں صرف اتنا ہی کہ زچگی خانہ کے باہر کچھ دیر ٹہلنا اور بار بار پوچھ لینا کہ بیوی کیسی

حال میں ہے۔ چنانچہ مناسب محل و موقعہ پر خداؤں کے سامنے جب یہ شکایت رکھی گئی تو یہ منظور کر لیا گیا کہ اقرارِ حمل سے پیدائش تک بے شک عورت ذمہ دار رہیگی لیکن دردِ زہ اور دیگر جسمانی تکالیف مرد برداشت کریں گے۔ اس تصفیہ کے بعد ہی مدّتِ معینہ پر ایک محترمہ کی زچگی کا وقت آ پہنچا اور اب انتظار اس کا تھا کہ شوہر کو مقررّہ وقت پر درد ہوں گے۔ اپنے پہلے ناخوشگوار اور تکلیف دہ تجربہ کے لئے شوہر تیار کے تیار رہ گئے اور ان کو کسی قسم کی تکلیف ہوئے بغیر بچّہ پیدا ہو گیا یہ راز کچھ دیر بعد کھلا کہ پیدائش کے وقت گھر کا ڈرائیور اپنے کمرہ میں تڑپتا اور کراہتا ہوا پایا گیا!

اپنے جوان لڑکے کو شراب اور عورتوں کے پیچھے برباد ہوتے ہوئے دیکھ کر بوڑھے باپ نے نصیحت کی۔ "بیٹا دو دو بُرائیوں میں ایک ساتھ پڑے رہو گے تو کہیں کے نہ رہو گے، بہتر یہ ہے کہ ایک ہی برائی پر اکتفا کرو، یا تو شراب نوشی کرو یا عورتوں سے ہی دل بہلاؤ"۔

لڑکے نے بہت غور کیا پر اس کی سمجھ سے باہر تھا کہ کس بُرائی کو چھوڑے۔ بالآخر اس نے باپ سے ہی ہدایت چاہی۔ باپ نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے جواب دیا:

"برخوردار ساٹھ سال کی عمر کے بعد شراب نوشی کیلئے کافی وقت رہیگا اس کو دھیان میں رکھو"۔

ایک صاحب اپنی بیوی کے لئے برا ئیر (چولی) خریدنے گئے ان کو سائز یاد نہ رہا سیلز گرل نے پوچھا "کیا خربوزہ جیسی سائز کے لئے دوں؟" انہوں نے کہا "نہیں نہیں اس سے چھوٹا سائز چاہیئے۔" لڑکی نے دریافت کیا "سنترے، نارنگی کا سائز؟" یہ بولے "نہیں جی اس سے بھی چھوٹا سائز"۔ لڑکی نے کہا "انڈے کی سائز ٹھیک رہے گی؟"
یہ کچھ دیر سوچے پھر کہا "ہاں ہاں ٹھیک ہے لیکن نیم برشت انڈے یعنی چیلے کا سائز دینا۔"

کسی عمر رسیدہ ڈھلی ہوئی خاتون نے بڑا ہی قیمتی برا ئیر خریدا۔ بڈھے شوہر نے بطور تمسخر پوچھا "اس میں کیا رکھو گی؟"
عورت چاہے بڈھی ہو کہ جوان، عورت ہی تو ہوتی ہے یہ سوال بُرا لگا اس نے پلٹ کر پوچھا "وہ جو تم پتلون کے اندر پہننے کی چڈیاں لاتے ہو اُن کا کیا مصرف ہے؟"

کہتے ہیں برا ئیر وہ جامہ ہے کہ جو رائی کا پہاڑ بنا دیتا ہے۔

ماں نے اپنے شیر خوار بچے کے بار بار پیشاب کر لینے کی عادت کے بارے میں کہا "ہم اپنی گائے کو پانی پلاتے ہیں اور وہ دودھ دیتی ہے اور اس کم بخت کو دودھ پلاتی ہوں تو یہ حرکت کرتا ہے۔"

دل کے ایک مشہور و معروف ڈاکٹر نے پردیس سے آئی ہوئی خاتون کے دل کی بیماری کا علاج کیا اور وہ بالکل بھلی چنگی ہو کر

اپنے ملک کو واپس ہونے لگی تو ڈاکٹر سے فیس پوچھی۔ علاج معالجہ کے لئے اپنی شکر گزاری کا اظہار کیا اور اپنے ملک کو آنے کی دعوت دی۔
ڈاکٹر نے سوچا یہ پردیسی ہے اس سے معاوضہ نہ لیا جائے تاکہ کبھی اس کے دیس جانے کا موقعہ ہوا تو مہمان داری بھی ہو جائے گی۔ اور کہا
"آپ پردیس سے آئی ہوئی ہیں اور ہمارے ملک میں مہمان ہیں آپ سے فیس نہیں لوں گا جس دل کو میں نے ٹھیک کیا ہے اس میں میرے لئے جگہ رکھیئے تاکہ کبھی آپ کے ملک کو آنا ہو تو آپ کا مہمان رہ سکوں۔"
خاتون نے جواب دیا "ڈاکٹر صاحب ضرور آپ کے لئے میرے دل میں جگہ رہے گی اور ہم آپ کو دعوت دیتے ہیں کہ ضرور آیئے گا۔ مگر ڈاکٹر صاحب خدا کا شکر ہے کہ یہ محض دل کی بیماری ہی تھی جو کوئی اندرونی اور نسوانی بیماری ہوتی تو بڑی پیچیدگی پیدا ہو جاتی۔"
جوان لڑکے نے اپنے باپ سے کہا "اپنے محلہ کی جو لڑکی رضیہ ہے نا اسی سے میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔" باپ جو اپنی جوانی میں کافی عیاشی کر چکے تھے بڑی سختی سے منع کرنے لگے اور کہا:
"میں اس شادی کی اجازت نہیں دے سکتا وہ تمہاری بہن ہے"
کچھ دنوں بعد لڑکے نے کسی اور کا انتخاب کر کے اجازت چاہی۔ باپ نے پھر اسی بات کا انکشاف کرتے ہوئے منع کیا۔ اسی طرح سے

یہ بے چارہ اپنے باپ کے کرتوتوں کے مارے دو تین لڑکیوں سے شادی نہ کر سکا تو اپنی ماں کو ساری بات بتائی۔ ماں نے یہ سُن کر کہا:

"بیٹے تم ان تمام لڑکیوں میں سے جس سے چاہو بخوشی شادی کرلو۔ ایک بھی تمہاری بہن نہیں لگتی اسلیئے کہ تم خود اپنے اس باپ کے بیٹے ہی نہیں ہو"۔

کم سن بچّے اپنی یادداشت کی باتیں کر رہے تھے۔ ایک نے کہا "مجھے اچھّی طرح یاد ہے کہ میں اپنی شیر خواری کے زمانہ میں ماں کو بہت ستایا کرتا تھا کبھی کتر لیتا۔ کبھی گھنٹوں منہ نہیں ہٹاتا"۔ دوسرے نے کہا "مجھے تو یہ بھی یاد ہے کہ میں اپنی ماں کے پیٹ میں کیسی گڑبڑ کیا کرتا۔ خوُب ہاتھ پاؤں چلاتا اور اندر ہی اندر دھکے دیتا"

تیسرے نے کہا "مجھے تو یہ بھی یاد ہے کہ ماں باپ کی شادی سے پہلے میں ایک پک نک پر اپنے باپ کے ساتھ گیا اور پھر ماں کے پیٹ میں واپس گھُر گیا"۔

ہمارے دوست واجد محمود اور ان کی بیوی الگ الگ کمروں میں سویا کرتے تھے، ہم نے ان کی بیوی سے پوچھا "رات میں کبھی تم دونوں اکٹھے ہونا چاہو تو کیا کرتے ہو؟" لیزا نے کہا "واجد کا دل چاہتا ہے تو وہ سیٹی بجاتے ہیں اور میں چلی جاتی ہوں"۔ ہم نے پھر پوچھا "اور جو تمہارا دل چاہے تو تم تو سیٹی نہیں بجا سکتی ہو؟"

لزا نے کہا "تو کیا ہوا میں خود سے اُن کے کمرے میں چلی جاتی ہوں یہ کہتے ہوئے کہ واجد تم نے سیٹی بجائی ؟"

شادی کے بعد ہی لفٹننٹ صاحب اپنی فوج کے میس میں پہنچے کرنل میجر اور کپتان سب ہی وہاں تھے اور بادہ نوشی کے سرور میں لفٹننٹ سے شادی کی رات کی روئداد کرید کرید کر پوچھنے لگے۔ کرنل نے اپنی مردانگی کا زور بتایا کہ پہلی رات انھوں نے بیوی کے ساتھ چار دفعہ محبت کی۔ میجر سے سوال کیا گیا تو اسنے کہا صرف تین دفعہ اور کپتان ظاہر ہے کہ اپنے سے بالاتر عہدہ داروں سے کسی طرح آگے نہیں رہ سکتا اس نے بتایا کہ صرف دو دفعہ۔ اب اس نوبت پر لفٹننٹ کو چھیڑ چھیڑ کر سوالات کر ڈالے اور اسی استفسار کا جواب مانگا اس نے بتایا "صرف ایک ہی بار"۔ اسپر سب ہی افسر ٹوٹ پڑے کہ آج کل کے نوجوانوں کو ہو کیا گیا ہے۔ اور وہ اس طرح پر کمزور کیوں پڑ گئے ہیں، پھر باصرار پوچھا گیا کہ کوئی تو معقول وجہ ہو اس کمزوری کی۔ جب لفٹننٹ جز بز ہو گیا تو اس نے بتایا "دراصل میری دلہن ان باتوں کی عادی نہیں تھی"۔

کسی منچلے عیاش زادے نے غریب کی لڑکی کو بہلا پھسلا کر ناجائز تعلقات قائم کر لئے اور وہ بے چاری حاملہ ہو گئی۔ غریب باپ کو بہت طیش آیا اور اس نے رئیس زادے کو پکڑ کر جان سے مار ڈالنے کی دھمکی دی اس رئیس نے اپنی دولت کا سہارا لے کر لالچ دلائی کہ

اگر اسکو لڑکی ہو گی تو وہ ۲۵ ہزار روپیہ اور لڑکا ہوا تو ۱۰ ہزار نقد دے گا تا کہ ان کی نگہداشت ہو سکے۔ روپیہ کی طمع نے غریب کی نیت ڈانوا ڈول کر دی غصہ ایک دم ٹھنڈا ہو گیا۔ کچھ کچھ راضی ہوتے ہوئے اس نے رئیس زادہ سے پوچھا "اور جو اسقاطِ حمل ہو جائے تو آپ میری لڑکی کو ایک اور موقع دیں گے نا؟"۔

افریقہ کے جنگلوں میں ایک گورا پادری بڑی لگن دہی اور جانفشانی سے اپنے مشن کا کام کر رہا تھا۔ محض اتفاق کی بات کہ ایک کالی حبشن کو سفید فام لڑکا پیدا ہوا۔ مقامی پادری نے اس پر ناجائز تعلقات کا الزام لگایا تو یہ بے چارا اپنی صفائی میں بہت ساری باتیں پیش کر رہا تھا کہ کس طرح قدرت سے اکثر سفید بچے پیدا ہوتے ہیں جنکو البینو کہا جاتا ہے۔ جب یہ بھی سمجھ میں نہ آیا تو اس نے سفید بھیڑوں کے منڈے کو بتا کر ایک کالی بھیڑ کی طرف اشارہ کیا، وہ وضاحت کرنا چاہتا تھا کہ کالے پادری نے اسکو روک دیا اور سرگوشی میں کہا "آپ کے راز کو ہم نہیں چھیڑیں گے اور آپ میرے اس راز کو فاش نہ کیجئے"۔

سمندری سفر پر ایک خوبصورت سی کم عمر لڑکی سے جہاز کے کپتان نے دوستی کر لی اور بار بار یہی تقاضا کرتا رہا کہ وہ لڑکی اسکے ساتھ بے تکلف ہو جائے۔ لڑکی ٹالتی رہی ادھر اصرار بڑھتا رہا کہ وہ لڑکی اسکے ساتھ بے تکلف ہو جائے۔ بالآخر کپتان نے اپنی دالہنا

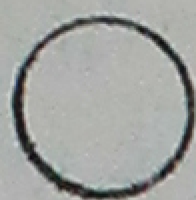
محبت کا واسطہ دیتے ہوئے کہا کہ اگر وہ نہیں مانے گی تو پھر وہ جہاز کا جہاز ہی ڈبو دے گا۔ لڑکی کو لگا کہ اس کی ایک کی وجہ سے ہزار بارہ سو مسافروں کی جان بچ جائے گی۔ وہ راضی ہو گئی اور رات کپتان کے ساتھ گزار کر دوسرے دن اپنی ڈائری میں لکھا "خدا کا شکر ہے کہ آج میری وجہ سے اور میرے اِتنے سے ایثار سے اتنے سارے لوگوں کی جان بچ گئی۔"

جہاز کا کپتان ڈو سال کے لمبے بحری سفر کے بعد گھر لوٹا تو گھر میں ڈو ماہ کے شیر خوار بچے کو دیکھ کر غیض و غضب سے چلا اٹھا اور پوچھا "بتا کیا یہ میرے دوست کمار کے کرتوت ہیں؟" بیوی نے کہا "نہیں" پھر پوچھا "میرا دوست راجن تو نہیں؟" اسپر بھی نفی میں جواب ملا تو کہا "تب تو ضرور یہ میرے دوست نند لال کی بدمعاشی ہو گی۔" اس پر بیوی کے غصّہ کا پارہ بھی چڑھ گیا اس نے ترکی بہ ترکی جواب دیا "کیا تم سمجھتے ہو کہ دنیا میں سب تمہارے ہی دوست ہیں میرا اپنا کوئی دوست ہی نہیں؟"

ایک بار لفٹ میں میاں بیوی اُتر رہے تھے لفٹ کھچا کھچ بھری تھی اور میاں ایک تیز و شوخ عورت سے چپکے کھڑے تھے۔ اتنے میں اس عورت نے زوردار چپت لگائی اُن کو اور پھر لفٹ سے اترتے ہی نکل کر تیز تیز چلی گئی۔ میاں نے بڑی معصومیت سے بیوی کو کہا "حاشا و کلا

میں نے کوئی شرارت یا گستاخی نہیں کی" بیوی نے مسکرا کر کہا" ہاں ہاں میں جانتی ہوں اسلیئے کہ اس عورت کو میں نے ہی بھیڑ میں چھیڑا تھا تاکہ تم اس مذاق کا شکار بن جاؤ"۔

چاندنی رات میں مہکتے ہوئے پھولوں کے باغ میں بڑے بڑے رومانی ماحول میں لڑکا لڑکی بہت دیر سے چپ چاپ بیٹھے تھے۔ لڑکی نے سرد آہ بھر کر کہا" تمہیں دیکھ کر مجھے امریکی فلمی ستارہ کلارک گیبل یاد آرہا ہے"۔ لڑکے نے اس مشابہت سے خوش ہو کر پوچھا" کیا سچ مچ میں اس جیسا ہوں؟" لڑکی نے کہا" بالکل۔ اور وہ بھی اسلیئے کہ اسکو مرے ہوئے برسوں ہو گئے"۔



بڑھاپے کے حوصلے بھی زندگی میں انوکھی چاشنی پیدا کرتے ہیں۔ تین بوڑھے اپنی ضعیف العمری کا رونا رو رہے تھے۔
ایک نے کہا "میں اپنی پیرانہ سالی کی وجہ سے بصیرت کھو بیٹھا ہوں۔ کوئی نوجوان لڑکی مجھ سے فلرٹ کرتی ہے تو مجھے دکھائی نہ دینے کے باعث اچھے اچھے موقعے کھو دیتا ہوں"۔ دوسرے نے کہا "یار مجھے اچھی طرح سنائی نہیں دیتا اس لیے جب کوئی لڑکی مجھے دور سے بلاتی ہے تو میں بدھو جیسا بے اعتنا دکھائی دیتا ہوں اور وہ ناراض ہو جاتی ہے"۔ تیسرے نے جو شائد ۸۰ سال کی سرحدوں سے اوپر ہی تھے بولے "دوستو میرا حافظہ ایسا کمزور ہو گیا ہے کہ بسا اوقات اپنی بیوی کے ساتھ محبت کرنے لگتا ہوں تو وہ مجھے یاد دلاتی ہے کہ میں نے آدھا پاؤ گھنٹہ قبل ہی تو اسکے ساتھ محبت کی ہے"۔

بہت زیادہ عمر ایک جوان لڑکی سے شادی کرنے چلے تو اُن کے دوست نے طنزیہ مشورہ دیا کہ وہ اپنے مکان میں کسی نوجوان پیئنگ گیسٹ کو رکھ لیں۔ بات گئی گزری ہو گئی۔ کچھ مہینوں بعد اُن سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے بتایا کہ ان کی نئی نویلی دُلہن حمل سے ہے۔

دوست نے اپنے دیئے ہوئے مشورہ کو یاد رکھ کر پوچھا "اور وہ جو پیئنگ گیسٹ رکھنے کو کہا تھا میں نے اسکا کیا حال ہے؟" بوڑھے میاں نے کہا آپ کے مشورہ کا شکریہ میں نے حسبہٖ عمل کیا اور اب وہ بھی حمل سے ہے"۔

۶۰ سے اوپر ایک عمر آدمی نے اپنے ساتھیوں کی محفل میں کہا "میں تو بڑی خوشگوار موت چاہتا ہوں کہ بستر مرگ پر میرے سارے عزیز اقربا دوست احباب ساتھ ہوں اور میں اپنے سارے حساب کتاب چکا کر موت کی آغوش میں چلا جاؤں"

دوسرے نے جو ۷۰ سال سے زیادہ ہی بوڑھے بننے خواہش کی کہ اُن کی زندگی کا اختتام اچانک اور یکایک کسی حادثہ یا قلب کی حرکت بند ہو جانے سے ہو اور وہ بلا کسی احساس کے رحلت کر جائے۔" تیسرے نے جو ۸۰ کے لگ بھگ بننے کہا "میری تو عین خواہش ہے کہ میری موت کسی حسین عورت کے شوہر کے ہاتھوں رقابت کے مارے پستول کی گولی سے ہو جائے"۔

ستر سال سے بھی زیادہ عمر رسیدہ شخص نے ڈاکٹر سے شکایت کی کہ وہ اب اپنی بیوی کے ساتھ محبت کرنے کے لائق نہیں رہا اور علاج کی خواہش کی۔ ڈاکٹر نے سمجھایا کہ اس عمر میں یہ قدرتی بات ہے کہ محبت کے قابل نہ رہے اور اس بارہ میں اسکو فکر نہ کرنا چاہئے۔ بوڑھے نے بتایا کہ اُسکا پچھتر سالہ پڑوسی دوست تو کہتا ہے کہ وہ اب بھی ہر رات

اپنی بیوی کے ساتھ محبّت کرتا ہے۔ ڈاکٹر نے مشورہ دیا " تب تو تم بھی اسی طرح کیوں نہیں کہتے "۔

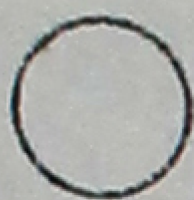
ضرورت سے زیادہ محتاط زندگی گذارنے کے باوجود بھی ستر سال کی عمر میں کچھ جسمانی تکلیف ہونے لگی تو ڈاکٹر کے مشورہ پر ورجیشوری کے گرم پانی کے چشموں میں نہانے کے لیئے راجندر چلے گئے' وہاں پر ایک ایسے صاحب سے ملاقات ہوئی کہ جو صورت کی جھرّیوں اور سفید بالوں سے بہت زیادہ ضعیف العمر دکھائی دیتے تھے لیکن جسمانی طور پر سیدھے نظر آتے تھے۔ راجندر نے پوچھا " آپ نے بھی ضرور اپنی زندگی احتیاط اور پاکیزگی سے گزاری ہوگی ؟" انہوں نے کہا " بالکل نہیں ۱۷، ۱۸ سال کی عمر سے ہی عیش کرنا شروع کر دیا تھا۔" راجندر نے کہا " خوب۔ خوب تب تو آپنے اپنی زندگی بہت اچھی بتائی ہے۔ بتائیے تو اب آپ کی عمر کیا ہے ؟" جواب ملا۔ " ۲۷ برس "۔

اسی سالہ بوڑھے نے ڈاکٹر سے شکایت کی کہ مجھ سے نوجوان لڑکیوں کا تعاقب کرنے کی عادت نہیں چھوٹتی۔ ڈاکٹر نے دلاسہ دیتے ہوئے پوچھا " اس میں پریشانی کی کیا بات ہے ؟"۔ بوڑھے نے کہا : ڈاکٹر صاحب مصیبت تو یہ ہے کہ جب لڑکی میرے ہاتھ آجاتی ہے تو مجھے یاد ہی نہیں پڑتا کہ مجھے کرنا کیا ہے "۔

سڑک کے کنارے ایک کم عمر لڑکے کو بیٹھے روتے ہوئے

دیکھ کر بڈھے نے از راہ ہمدردی وجہ پوچھی۔ لڑکے نے بتایا "میں اسلئے رو رہا ہوں کہ بڑے بڑے لڑکے جو کچھ کرتے ہیں وہ میں نہیں کر سکتا۔"
بڈھے میاں خود بھی اُسکے بازو بیٹھ گئے اور آنسو بہانے لگے۔

نئی نئی شادی شدہ جوڑے کو کسی تھیٹر کی شاندار افتتاح کے بڑھیا درجے کے ٹکٹ وصول ہوئے۔ انہوں نے اپنے سارے دوستوں سے پوچھا کہ کس کی مہربانی سے وہ ٹکٹ ملے ہیں لیکن سارے ہی دوستوں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ مقررہ تاریخ پر یہ دونوں اپنا گھر بند کر کے بڑے اہتمام سے ڈرامہ دیکھنے گئے۔ اور بہت محظوظ ہوئے۔ آدھی رات کے بعد جب گھر لوٹے تو سارا گھر تتر بتر تھا، شادی کا سارا زیور غائب تھا اور زیورات کے ڈبہ پر ایک کارڈ رکھا تھا۔
"اب آپ جان گئے ہوں گے کہ ٹکٹ کس نے دیئے تھے!"



آج کل تمباکو نوشی سے متعلق جسقدر باتیں ہوتی ہیں اس پس منظر کے ساتھ حسبِ ذیل حکایتیں بھی خوب ہیں۔

سگریٹ سگار کی بڑی سی دوکان پر ایک گاہک قیمتی اور بڑھیا سے بڑھیا سگار خرید رہا تھا۔ کسی نے جملہ معترضہ کے طور پر پوچھا "جناب آپ اتنے گراں قیمت سگار کب سے پی رہے ہیں؟" گاہک نے بتایا کہ وہ تو تقریباً ۲۰ برس سے یہی سگار پی رہا ہے اور دن بھر میں وہ کوئی ۱۰، ۱۵ سگار ضرور پی لیتا ہے۔

ان صاحب نے کچھ حساب کتاب ذہن میں جوڑا پھر کہا: "اگر آپ نے سگار پر اتنا سارا روپیہ ضائع نہ کیا ہوتا تو وہ سامنے والی عالیشان کوٹھی کے مالک ہوتے"۔ سگار خریدنے والے نے ان سے پلٹ کر پوچھا "آپ سگار سے شوق فرماتے ہیں؟" انھوں نے کہا: "نہیں"۔ اس نے پھر پوچھا "تو پھر آپ اس عمارت کے مالک ہیں؟" انھوں نے جواب دیا "نہیں"۔

اس پر اس نے اپنے سگار کے ڈبے دوکان سے لیتے ہوئے انکو بتایا "جی وہ جو عمارت آپ نے بتائی ہے، میں ہی اس کا مالک ہوں!"



دوستی کا حق ادا کرنے کے بھی بے شمار طریقے ہیں اس میں نمایاں حصہ قرض اور مانگی تانگی اشیا کی واپسی کا ہے۔

ویران اور سنسان جگہ پر ڈاکوؤں نے بس کو روک کر مسافروں کو لوٹنا شروع کیا۔ اس گڑبڑ میں ایک صاحب نے اپنے ساتھی سے کہا "لو دوست میں نے تم سے ۲۰۰ روپیہ جو قرض لیا تھا وہ واپس کیے دیتا ہوں اب تمہارا اور ہمارا حساب بے باق"۔

ایک صاحب بری طرح مقروض تھے۔ قرض خواہوں نے ان کو عدالت میں گھسیٹا۔ انہوں نے بڑی لجاجت کے ساتھ عدالت سے مہلت مانگی تاکہ وہ اپنی ساری جائداد۔ موٹریں فرنیچر باغ سب کچھ بیچ کر قرضہ چکائیں۔ قرض خواہوں نے کہا "یہ جھوٹ بکتا ہے اسکے پاس جائداد مال املاک موٹریں کہاں ہیں جنکو بیچ کر یہ قرض اتارنے کیلئے مہلت مانگ رہا ہے"۔ اسپر اس شخص نے معروضہ کیا "سرکار جب یہ جانتے ہیں کہ میرے پاس کچھ ہے ہی نہیں تو پھر یہی بتائیں کہ میں ان کا قرض کیسے چکایا کروں؟"

ایک دن ہمارے ایک دوست تشریف لائے اور وہ چھتری جو انہوں نے ہمیں مستعار دی تھی واپس مانگی۔ ہم نے کہا "بھئی اسے

ہمارے ایک اور دوست مانگ کر لے گئے ہیں، کیا آپ کو اس کی ضرورت
تھی؟" انہوں نے بتایا "جی ایسی کوئی خاص ضرورت میرے لئے نہ تھی
مگر میں جن سے اُسے مانگ کر لایا تھا وہ کہتے ہیں کہ اُسکے مالک نے اُن
سے واپس کرنے کو کہا ہے"۔

مانگے تانگے کی کتابیں پڑھنے کا شوق تو عالم گیر ہے
ہی اس خصوص میں کہتے ہیں کہ مانگنے پر کتابیں مستعار دینے والا بے وقوف
ہوتا ہے اور پھر جو مانگے کی کتابیں واپس کرتا ہے اس کے متعلق کہتے
ہیں کہ وہ تو انتہائی بے وقوف ہے۔

دو دوست آپس میں کسی بات پر لڑ پڑے جھگڑا بڑھتا
گیا۔ لوگ بھی جمع ہو گئے اور پولیس بھی آگئی اور ان دونوں کا نام وام لکھا
جانے لگا تب ان کے ہوش ٹھکانے آئے اور گھبرا کر بھاگ نکلنا
چاہا لیکن پولیس مین اپنی رپورٹ کی خاطر نام اور پتہ بتانے پر اصرار کرنے
لگا ایک نے دوسرے سے کہا " راجندر کھنہ تم اپنا نام ہرگز نہ بتانا ورنہ
پولیس کے چکر میں پھنس جاؤ گے"۔ راجندر بولے "چنگیز خاں تم بھی اپنا نام
بتانا نہ اُن سے کہنا کہ ہم لوگ قلابہ پوسٹ آفس کے سامنے ینیتا
بلڈنگ میں رہتے ہیں"۔

ہمارے ایک پرانے دوست ملے اور پوچھا "مجھے ۱۰۰
روپیوں کی ضرورت ہے کیا آپ بطور قرض دے سکیں گے؟" میں نے

کہا" ضرور"۔ اسپر وہ جھٹ سے بولے "تب تو آپ ایسا کیجئے مجھے ۱۰۰ کے منجملہ صرف ۵۰ ہی دیدیجئے"۔ "کیوں؟" میں نے جاننا چاہا۔ "اسلئے کہ اگر آپ مجھے ۵۰ روپے دیں گے تو میں ۵۰ روپیوں کا ہی مقروض رہوں گا اور باقی ۵۰ کے لئے آپ میرے قرضدار رہیں گے اس طرح ہم دونوں برابر ہوجائیں گے"۔

اشفاق نے شکایت کی کہ شہاب نے اس سے ۲۰۰۰ روپے بطور قرض لئے تھے اور واپس کرنے کا نام ہی نہیں لیا۔ ہم نے کہا "وکیل کے ذریعہ نوٹس دلوا دو ہوش ٹھکانے آجائینگے شہاب کے"! اشفاق نے کہا "یار ہمارے پاس نہ تو کوئی رسید ہے نہ ثبوت"! ہم نے کہا "تب تو تم ہی ایک سیدھا سادھا خط لکھو کہ وہ تمہارے ۵۰۰۰ روپے فوراً واپس کرے"

اشفاق نے کہا "مگر اس نے تو صرف ۲۰۰۰ روپے لئے ہیں" ہمنے کہا "اسی لئے تو ۵۰۰۰ لکھ کر بھیجو وہ فوراً جواب میں لکھے گا کہ ۵۰۰۰ نہیں لئے تھے بلکہ صرف ۲۰۰۰۔ اور پھر یہی تحریر تمہارے ہاتھ میں ثبوت ہوگی"۔

چار دوستوں میں گہری محبت تھی ان میں سے ایک کے انتقال پر ایصال ثواب کی خاطر تینوں نے طے کیا کہ بچھڑنے والے دوست کی قبر میں سو سو روپے ہر شخص رکھ دے گا۔ ایک نے تو نقد سو کا نوٹ رکھ دیا

دوسرے نے بیرر چیک کھدیا تیسرے نے مرحوم کے نام تین سو کا چیک بنایا اور سو کی نوٹ اور سو کا چیک اُٹھا لیا۔ حساب کتاب برابر ہو گیا۔

ایک کسان نے دوسرے کسان سے پوچھا "پچھلے سال جب تمہاری بھینس بیمار ہوئی تھی تو تم نے اس کی دوا دارو کے لئے کیا کیا تھا؟"

پہلا کسان بولا "میں نے اپنی بھینس کو بھلاوہ کوٹ کر کھلا دیا تھا"۔

دوسرے کسان نے جھٹ گھر پہنچ کر اپنی بیمار بھینس کو بھلاوہ کوٹ کر کھلا دیا کیونکہ اس کی بھینس بھی بیمار تھی۔ بھلاوہ کھاتے ہی اس کی بھینس تڑپ تڑپ کر مر گئی۔

اس پر دوسرے کسان کو بیحد تاؤ آیا وہ اسی وقت لاٹھی لے کر پہلے کسان کے گھر پہنچا اور لگا شکایت کرنے "اچھی دوا بتائی میری بھینس کے لئے۔ وہ تو بھلاوہ کھاتے ہی مر گئی!"

پہلے کسان نے کہا "مر تو میری بھینس بھی گئی تھی"

"پھر تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟" دوسرے کسان نے شکایت کرتے ہوئے کہا۔

"تم نے پوچھا کب تھا۔ پوچھتے تو بتا دیتا"۔

ایک بار ہم اپنے ایک بہت پرانے دوست سے بڑی مدت کے بعد بنگلور میں ملنے گئے۔ وہ بہت خوش ہوئے گلے لگا لیا۔

اتنے عرصہ تک نہ ملنے کی شکایت کی اور پھر کہا "یار آج رات کا کھانا ہمارے گھر کھانا، ہم ابھی بیوی کو فون کئے دیتے ہیں۔"

پھر فون پر نمبر ملایا اور جلدی جلدی بغیر کچھ سُنے کہا "میرا پرانا ساتھی اور دوست آیا ہوا ہے اسکو آج ڈنر پر گھر لاؤں گا۔" اُدھر سے فون پر جواب ملا "ہاں ضرور لاؤ اپنے دوست کو اُن سے مل کر بیحد خوشی ہوگی۔"

یہ سنتے ہی انہوں نے فوراً ریسیور واپس رکھدیا اور کہا "غلط نمبر مل گیا ہے ...! یہ میری بیوی نہیں ہو سکتی۔"

ہم نے اپنے دوست کا شکریہ ادا کیا کہ انہوں نے ہماری سالگرہ پر بہت اچھا تحفہ دیا۔ انکساری سے دوست نے کہا "اجی تحفہ بہت معمولی ہے شکریہ کی زحمت نہ کیجئے۔"

ہماری زبان سے بے اختیار نکل گیا۔ "جی ہاں میرا بھی یہی خیال تھا لیکن بیوی صاحبہ کا حکم ہے کہ ہم کو بہر صورت شکریہ ادا کرنا ہی چاہیئے۔"



یہ تو سب ہی کو معلوم ہے کہ بمبئی میں سب کچھ مِل سکتا ہے مگر رہنے کو ٹھکانہ بڑی سے بڑی قیمت پر بھی مشکل ہی سے ملتا ہے۔ ایک نوجوان کی شادی کی بات ہو رہی تھی۔ لڑکی کے علاوہ اُس کے والدین کو بھی یہ نوجوان پسند تھا اور انہیں یہ رشتہ منظور تھا۔ بات پکی ہو رہی تھی کہ ہونے والے خسر نے اُن سے دریافت کیا "صاحبزادہ تمہاری نوکری بھی اچھی ہے کمائی بھی خاصی ہے لیکن یہ تو بتاؤ کہ شادی کے بعد میری لڑکی کو رکھنے کیلئے کوئی فلیٹ بھی ہے؟" لڑکے نے بھی اس بات پر زیادہ غور نہیں کیا تھا مگر اطمینان سے یہ کہہ دیا۔ "جی۔ وہ تو میں نے سوچا تھا کہ آپ ہی کا گھر داماد ہو کر آپ کے گھر ٹھہر جاؤں گا!"

ہونے والے خسر اپنی کرسی سے اُچھل پڑے اور گھبرا کر کہنے لگے "خود میرا اپنا کوئی ٹھکانہ نہیں میں خود ابھی تک کسی کے گھر میں گھر داماد بن کر پڑا ہوا ہوں۔"

اسی طرح کے ایک اور نوجوان نے شادی کے لئے اشتہار اس طرح دیا۔

"ضرورتِ رشتہ۔ ایک قبول صورت معقول آمدنی والے نوجوان کے لئے، ایک شادی شدہ لڑکی کی۔ لڑکی کسی مذہب ذات اور فرقے کی ہو سکتی ہے۔ شکل

وصورت جیسی ہو چلے گی۔ لڑکی کا فوٹو بھیجنے کی ضرورت نہیں ہے البتہ اسکے رہائشی مکان کا فوٹو آنا ضروری ہے"۔

ایک ویران سی سڑک پر کسی نے روک کر ہم سے پوچھا، "کیا آپ نے آس پاس میں پولیس کے کسی سپاہی کو دیکھا؟"

ہم نے کہا "نہیں"۔

تب وہ آدمی ہمارے قریب آکر بولا "تب تو اپنی گھڑی اور جیب کا روپیہ پیسہ فوراً حوالے کر دیجئے۔!"



انگریزی تہذیب میں بیوی کی ماں سے شوہر کو ہمیشہ مرعوب پایا گیا ہے۔ کسی گھڑی ساس اور داماد کی بنتی ہی نہیں اور جب کبھی وہ غریب اپنی لڑکی کے پاس آکر رہنا چاہتی ہے تو بڑے ہنگامے کھڑے ہوتے ہیں ساری تدبیریں کی جاتی ہیں کہ یہ بلا ٹل جائے۔

ایک صاحب اپنا السیشین کتا جانوروں کے ڈاکٹر کے پاس لے گئے کہ اسکی دُم جڑ سے کاٹ دیجائے۔ ڈاکٹر نے کہا اس ذات کے کتے کی دم نہیں کاٹی جاتی۔ یہ بہت اصرار کرنے لگے تو حسب خواہش دُم کاٹ دیگئی مگر ڈاکٹر نے اُن سے پوچھا کہ کچھ وجہ بھی تو بتائی جائے؟۔ انہوں نے وضاحت کی "دراصل بات یہ ہے کہ میری ساس آنے والی ہیں اور ان کی آمد پر ظاہر ہے کہ یہ کتا خوش آمدید کے طور پر دُم ہلاتا ہوا اُن کی طرف بھاگے گا، اسی لئے میں نے دُم ہی نکال دی کہ نہ رہے دم اور نہ کوئی آثار اور اشارے خوش آمدید کے میری ساس کو دکھائی دیں۔"

ساسوں پر یہ واجبی الزام بھی ہوتا ہے کہ وہ اپنی لڑکیوں کو اس بات پر ابھارتی ہیں کہ شوہر سے ان کا چھوٹے سے چھوٹا بھی جھگڑا ہو تو وہ جھٹ سے میکے پہنچ جائیں چنانچہ ایسے ہی ایک موقعہ پر لڑکی

جب اپنے والدین کے گھر پہونچی تو دیکھا والد صاحب گھر کے باہر ہی اُداس بیٹھے ہیں اور جب اُس نے اپنی روداد سنائی تو بےچارے باپ نے بڑی محبت سے کہا "بیٹی کیا بتاؤں تیری ماں بھی تو مجھ سے روٹھ کر ابھی اپنے میکے چلی گئی"۔

بڈھی بے سہارا عورتوں کے ادارہ کے لئے امداد طلب کرتے ہوئے جب سرگرم کارکن ہمارے ایک دوست کے گھر پہنچے تو انھوں نے ساری باتیں توجہ سے سنیں اور کہا "آپ کے ادارہ کے لئے میری یہ پیشکش ہے کہ آپ میری بوڑھی ساس کو لیتے جائیں"۔

اپنی ساس کی متوقع آمد پر صاحب خانہ نے اپنی بیگم کے سامنے باورچی کو بُلا کے پکوان کی ایک فہرست دی۔ بیگم نے فہرست دیکھکر خوشی سے کہا "مگر اِس فہرست میں تو وہ سب پکوان درج ہیں جو میری اماں کو بیحد مرغوب ہیں"۔

"اسی لئے تو باورچی کو دے رہا ہوں" صاحبِ خانہ نے باورچی کو ہدایت دیتے ہوئے کہا۔ "دیکھو جب تک میری ساس یہاں موجود رہیں ان میں سے ایک پکوان بھی نہ پکے"۔

ایک بار کسی کی ساس کو ڈاکو اغوا کر کے لے گئے اور داماد کے نام خط بھیجا جس میں دس ہزار روپے کا مطالبہ تھا۔ خط پڑھتے ہی امیر داماد نے دس ہزار کا بندوبست کر لیا۔ اُس کی بیوی خوش ہو کر بولی "کیا تم

سچ مچ میری ماں کیلئے دس ہزار روپے ڈاکوؤں کو دے دوگے، پیارے!"

"ہاں ڈارلنگ" اس کے شوہر نے جواب دیا "کیونکہ ڈاکوؤں نے لکھا ہے اگر آپ نے دس ہزار روپے دو دن کے اندر ادا نہیں کئے، تو آپ کی ساس آپ کو فوراً لوٹا دی جائے گی!"

اس اطلاع پر کہ ساس صاحبہ کا پیر پھسلنے پر ندی میں گر کر بہہ گئی ہیں، سعادتمند داماد ندی کے کنارے پہنچے اور پانی کے بہاؤ کی مخالف سمت میں ساس کو ڈھونڈھنے چلے۔ لوگوں نے پوچھا کہ بہاؤ کی طرف کیوں نہیں ڈھونڈھتے؟

"آپ ہماری ساس کو نہیں جانتے وہ اپنی فطرت سے مجبور ہیں اور ساری دنیا جدھر جاتی ہے یہ ہمیشہ اسکی مخالف سمت چلتی ہیں۔"



کسی شاہی دربار میں بحث چھڑی کہ بعض محاورے اور کہاوتیں بھی غلط سلط طور پر مشہور ہو جاتی ہیں۔ بادشاہ نے مثالاً کہا "عذرِ گناہ بدتر از گناہ"۔ کتنی مہمل بات ہے۔ بھلا ایسے بھی کہیں ہو سکتا ہے کہ برا کام کر کے اس کی عذرداری کی جائے تو وہ برے کام سے بھی زیادہ بری بات ہو جائے"۔ وزیر نے باادب عرض کیا "حضور بالکل ہو سکتا ہے اور یہ کہاوت بالکل درست ہے"۔ بادشاہ سلامت نے کہا "تم نے ہماری بات کاٹی ہے اسکو ثابت کرنا ہوگا ورنہ گردن اڑا دی جائے گی"۔ وزیر نے مہلت مانگی اور کچھ دن بعد رات کے اندھیرے میں بادشاہ کی خوابگاہ میں گھس کر بادشاہ کو پیار کر لیا۔ بادشاہ نے روشنی جلائی اور غضبناک طریقہ پر پوچھا "یہ کیا بدتمیزی ہے؟" وزیر نے گھبراہٹ اور انفعال کا اظہار کرتے ہوئے کہا "سرکارِ عالی۔ خادم گستاخی کی معافی چاہتا ہے میں نے اندھیرے میں سمجھا کہ ملکہ کی خوابگاہ ہے اور میں نے ملکہ کو پیار کیا"۔ باشاہ کے قہر و غصہ کی انتہا نہ تھی کہ یہ حرکت ملکہ کے ساتھ۔ اور اس گناہ کی پاداش میں وزیر کا سر قلم کرنے کا حکم دیا۔ وزیر نے بادشاہ کو یاد دلایا کہ گناہ تو جو کچھ تھا سو تھا اس کا عذر پیش کر کے بھی وزیر کو جان سے

ہاتھ دھونا پڑتا تھا۔ بادشاہ نے اس کہاوت کی نزاکت کو سمجھ کر جان بخشی کی۔
"دیانت داری بہترین تدبر اور مصلحت ہے۔"
(HONESTY IS THE BEST POLICY) اور
(HONESTY ALWAYS PAYS) "دیانت داری کا صلہ ہمیشہ ملتا ہے۔"

ایک صاحب بس میں سفر کر رہے تھے۔ بہ منزل مقصود پر پہنچ کر اترنا چاہتے تھے لیکن کنڈکٹر آس پاس کہیں نہ تھا اور اس نے ان سے ٹکٹ کے پیسے بھی نہیں مانگے تھے۔ اُن کا جی تو چاہا کہ چپکے سے اتر پڑیں مگر ضمیر نے بغاوت کی عقل سلیم نے روکا اور انہوں نے کنڈکٹر کو ڈھونڈھ کر اپنے کرایہ کے ۲۵ پیسے دیدیئے۔ کنڈکٹر کچھ گڑبڑ میں تھا نیا نیا ملازم ہوا تھا بے خیالی میں کسی اور کے دیئے ہوئے دس روپیہ کے نوٹ کے ۹ روپے ۷۵ پیسے ان کو دے کر آگے بڑھ گیا۔ ان کی باچھیں کھل گئیں۔ خوشی کے مارے اُچھل کر بس سے کود پڑے اور دل ہی دل میں کہا "سچ ہی تو ہے" دیانت داری کا صلہ ضرور ملتا ہے۔"

"خیرات اور اس کی برکات"

کسی محفل میں ایک علامہ دین اور دنیا کی باتیں بتا رہے تھے ساتھ ساتھ انہوں نے قرآن مجید اور حدیث کے حوالے سے خیرات کے فضائل اسکا ثواب اور برکت کو اس موثر طور پر بتایا کر حاضرین محفل میں سے

ایک صاحب جو خود بیحد متمول مگر انتہائی کنجوس اور خسیس تھے تڑپ کر اٹھے اور کہا "خدائے تعالیٰ نے بھی اپنی لامتناہی مہربانیوں سے ثواب کمانے اور آخرت کو سنوارنے کے کیا کیا موقع دیئے ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ جھولی ڈال کر گھر گھر خیرات وصول کرتا پھروں تاکہ لوگوں کو ثواب دارین حاصل کرنے کا موقع ملے۔"

لیموں نچوڑ تو اب اچھا خاصا محاورہ کے طور پر استعمال ہوتا ہے لیکن اس کی ابتدا کچھ ایسی بیان کی جاتی ہے کہ ایک صاحب مستقل طور پر لیموں اپنے ساتھ لئے پھرتے اور جہاں کہیں کسی کو کھانا کھاتے دیکھتے یہ فوراً ہی اپنے لیموں کو کاٹ کر اس کے سالن پر رس نچوڑتے اور کہتے "اب دیکھئے اس کا ذائقہ کتنا لذیذ ہوگیا ہے۔" شروع شروع تو اسکو عنایت سمجھ کر ان کو بھی کھانے میں شریک کرلیا جاتا اور یہ مفت خوری کا خوب مزہ اٹھاتے۔ لیکن ان کی یہ عادت کچھ حد سے بڑھ گئی اور لوگ ان سے گھبرانے لگے۔ ایک مرتبہ کسی نے اپنی ناپسندیدگی کا کھلم کھلا اظہار کیا اور ان کو دور رکھنے کی کوشش کی مگر اب یہ کہاں باز آنے والے۔ نوبت بایں جا رسید کہ ان کو ہاتھوں سے ڈھکیل کر دور رکھنے کی کوشش کی گئی مگر انہوں نے نہ ماننا تھا نہ مانا۔ حتیٰ کہ مارپیٹ تک بات پہنچ گئی۔ جتنی ان کو مار پڑتی یہ بڑے کھل کر ہنستے اور ہاتھ ڈال ڈال کر کھاتے رہے۔ ان کی بے غیرتی کی حد نہ تھی اور پھر بڑی خندہ پیشانی

سے کہنے لگے "واللہ آج کے کھانے میں تو مزہ آگیا اور اس پٹائی پر تو والدہ مرحومہ یاد آرہی ہیں کہ وہ بھی اسی طرح مار مار کر کھلایا کرتی تھیں"۔

ایک صاحب بار بار اپنے بھائی کے گھر ٹیلی فون کر کے پوچھتے تھے کہ بھابی کو لڑکا پیدا ہوا ہے یا لڑکی۔ کسی نے حیرت سے پوچھا کہ ان کو اس کی اتنی فکر کس لئے تھی۔ چاہے لڑکا ہو یا لڑکی ان کو کیا فرق پڑنے والا تھا۔ یہ بولے "واہ واہ یہ بھی خوب رہی کہ مجھے کوئی فرق پڑنے والا نہیں۔ ارے اگر وہ لڑکا ہوا تو میں چچا بنوں گا اور لڑکی ہو تو چچی"۔



مشاعروں میں بھی سامانِ لطافت وافر مقدار میں ملتا ہے اور شاعروں کی فطری حسِیّت شعروں کے سوا بھی داد دیئے بغیر نہیں رہتی۔

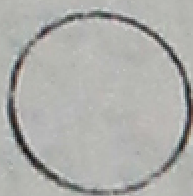
بھرے مشاعرے میں حزیں کی باری آئی خود اعتمادی کے ساتھ یہ میکروفون کے سامنے کھڑے ہوئے۔ حاضرینِ محفل کو مسکرا کر دیکھا بیاض نکال کر بطور تخاطب کہا "مطلع عرض کیا ہے"۔

سامعین کچھ موڈ میں نہ تھے کوئی ردِّ عمل نہ ہوا پھر بھی یہ شعر سنانے لگے ہر شعر پر داد طلب نظروں سے ایک ایک کو دیکھا لیکن کسی نے توجہ نہ کی پھر تو بیاض بند کی اور کہا "معزز حاضرین باقی اشعار بھی کچھ اسی طرح کے ہیں"۔ اور شہ نشین سے اُتر آئے۔

شاعروں کی سامعہ نوازی مشہور ہے اور یہ سامعین کے اس قدر جویا رہتے ہیں کہ جب کسی شاعر سے بعد مرگ پوچھا گیا کہ وہ جنت جانا پسند کریں گے یا دوزخ۔ انہوں نے بلا پس و پیش بارگاہِ خداوندی میں معروضہ کیا "جہاں بھی ذوقِ شعر اور تابِ شنیدن رکھنے والوں کی تعداد زیادہ ہو مجھے وہیں رکھ دیا جائے تو مہربانی ہوگی"۔

ہمارے دوست رعنا مدت سے شعر کہا کرتے ہیں، ایک

بار وہ آئے تو بے حد شاداں و فرحاں۔ اور مشہور و معروف رسالہ کی وہ کاپی سامنے رکھی جس میں ان کی نظم چھپی تھی اور بڑے فخریہ انداز سے کہا "اس نظم پر مسلسل چار سال سے محنت کی ہے" ہم نے پوچھا "یہ تو بڑی مختصر سی نظم ہے اس کے لئے چار سال کی مشقت کیسے لگی؟" انہوں نے بتایا "نظم تو میں نے بس ایک گھنٹہ بھر میں لکھ لی تھی اس کی اشاعت کے لئے چار سال لگے ہیں۔"



آئی ایس۔ جوہر آپ بیتی سناتے ہیں۔ اُن کا جڑواں بھائی
بچپن سے ہی بڑا شریر تھا، لیکن بہت ہی چالاک۔ چھوٹے پن میں جتنی
شرارتیں کیا کرتا اس کی سزا انہیں ملا کرتی کہ وہ سارا دوش ان پر ڈھکیل دیا
کرتا۔ یہ خود پڑھنے میں ہوشیار تھے پرچے بہترین کرتے لیکن اچھے
نمبر انہیں کے پرچوں پر بھائی کو مل جاتے۔ امتحانات یہ پاس کرتے
اور ڈگریاں بھائی کو مل جاتیں۔ جوانی تک چوری اور ڈاکے بھائی نے کئے
اور سزا انہیں ملی۔ جوہر کا خیال ہے کہ وہ اس سے اب بدلہ لے کر ہی
رہینگے۔ یہ خود مر جائیں گے اور بھائی کو دفنا دیا جائے گا۔

ایکبار نادار طلبار کی امداد کے لئے جلسہ کیا گیا اس میں آئی،
ایس جوہر بھی مہمان خصوصی کی حیثیت سے مدعو تھے۔ اور اپنی تقریر میں
کہا "مجھ سے کہا گیا تھا کہ یہ (POOR STUDENTS) کی مدد کیلئے
جلسہ ہو رہا ہے۔ میں بخوشی چلا آیا کہ میں خود بھی اپنے زمانہ میں کمزور
طالب علم تھا"

مجھ سے اور یوسف ناظم سے مخاطب ہو کر سلمیٰ صدیقی نے
کہا "آپ دونوں اپنی اپنی بیویوں کے ساتھ کسی دن کھانے پر تشریف

للئیے"۔ ہم نے احتجاج کیا کر یہ اپنی اپنی بیویوں والی شرط کرتی ہے۔
سلمیٰ صدیقی کو سبزی کی خریداری میں منہمک دیکھ کر ہریندرناتھ
چٹوپادھیائے نے سبزیوں کی طرف اشارہ کر کے کہا:
"ادب (لٹریچر) کی طرح یہ بھی بکھری پڑی ہیں۔"
سلمیٰ صدّیقی نے برجستہ کہا "مگر ان میں VARIETY بہت
زیادہ ہے۔"



آغا جان کاشمیری ایک نئی کتاب لکھ رہے ہیں جس میں وہ اپنے مشاہدہ کی بنیادوں پر شادی شدہ جوڑوں کی سلور جوبلی تک کے واقعات اور جوبلی کی روداد لکھنا چاہتے ہیں۔ میں نے انہیں یاد دلایا کہ ایسے ہی ایک موقعہ پر جبکہ جشنِ سیمیں کی خوشیاں منائی جارہی تھیں شوہر کو آنسو بہاتے اور دلگیر دیکھا۔ ظاہر ہے کہ سبھوں نے ان کی اشک شوئی کرنی چاہی اور پوچھا کہ ایسے مبارک اور خوشی کے موقع پر یہ رونا دھونا کیا انہوں نے حد درجہ افسردگی کے عالم میں بتایا "آج سے پچیس سال پہلے جب اِن نیک بخت خاتون سے بحالتِ مجبوری شادی ہوئی تھی تو ہم دونوں کی بالکل نہیں بنتی تھی اور ایک موقعہ پر تو میں نے غصّہ کے مارے ان کا گلا گھونٹنے تک کا مصمم ارادہ کر لیا تھا لیکن اس ڈر کے مارے کہ ۲۵ سال کی قید کی سزا ہوگی ارادہ ترک کر دیا تھا اور آج اسی بات کا افسوس کر رہا ہوں کہ اس دن ذرا ہمّت سے کام لے لیا ہوتا تو آج اپنی قید کی مدت پوری کر کے پھر سے آزاد انسانوں میں شریک ہو جاتا۔"



سائنس کے انتہائی ترقی یافتہ دور میں ایک صاحب دوسری دُنیا میں پہنچ گئے۔ وہاں پر دیکھا کہ سیکڑوں مشینیں لگی ہیں۔ اس کے مختلف بٹن دبانے پر حسبِ خواہش لڑکا یا لڑکی مشین میں سے نکل آتے ہیں ان کو بڑا اچنبھا سا لگا انہوں نے پوچھا "کیا یہاں پر اس طریقہ سے بچّے پیدا کیئے جاتے ہیں؟" لوگوں نے بتایا کہ بس اسی طریقے سے ان کی آبادی میں اضافہ ہوتا ہے اور الٹ کر ان سے دریافت کیا کہ ان کی دنیا میں کیسے ہوتا ہے۔ انہوں نے ساری تفصیل بتائی کہ عورت اور مرد آپس میں شادی کرتے ہیں پھر ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہیں اسکے بعد عورت کو حمل ہوتا ہے اور اسکے پیٹ میں بچہ پلتا ہے اور نو مہینے کی مدّت کے بعد بچہ پیدا ہوتا ہے اُس دنیا کے لوگوں نے غور سے سنا اور پھر بتایا "ہاں ہاں کچھ اسی طرح پر ہم اپنی موٹریں پیدا کرتے ہیں بچے نہیں۔ دراصل اس میں دشواری یہ ہے کہ جب کبھی عمل تولید کو بڑھانا ہوتا تو ہم ایک سے زائد آدمی کو اس کام پر نہیں لگا سکتے۔"

تجارت وصنعت کی دنیا بھی ظرافت ومذاق سے خالی نہیں۔ کبھی کسی کی ہوشیاری سے اور کبھی نادانی سے ہر صورت قہقہے پیدا ہوتے

ہیں۔ ایک صاحب بنک میں پہلی بار اپنا کھاتہ کھولنے گئے اور جملہ فارمس کی خانہ پری کرکے عہدہ دار متعلقہ سے کہا۔ "یہاں لکھا ہے۔ جوائنٹ اکونٹ (مشترک کھاتہ)۔ اور میں بھی یہی چاہتا ہوں اب آپ ہی بتا دیجئے کہ آپ کے بنک میں سب سے زیادہ روپے والا کھاتہ دار کون ہے میں اسی کے ساتھ اپنا مشترکہ کھاتہ کھولنا چاہتا ہوں"۔

ایک تجربہ کار اور ماہر انجینیر نئی صنعت کی بنیاد ڈالنا چاہتے تھے انھوں نے ایک بڑے سرمایہ دار کو پکڑا اور اس صنعت کے سارے فائدے اور منافع کی صورتیں بتائیں اور خواہش کی کہ وہ ان کی شراکت قبول کریں۔ "تجربہ میرا رہیگا سرمایہ آپ کا" سرمایہ دار نے پوچھا "فی الحال تو یہی رہیگا لیکن اسکی کیا گیارنٹی ہے کہ آگے چل کر تجربہ (تلخ) میرا اور سرمایہ آپ کا نہ ہو جائے"۔

اپنے عزیز دوست خلیل کی بہن کی شادی کے رقعے تقسیم کرنے تھے وہ اور ہم دونوں موٹر میں نکلے کہ جہاں تک ممکن ہو خود ہی بانٹ دیں گھومتے گھومتے سر شام حیدر آباد کے ایک بدنام سے محلہ محبوب کی مہندی پہنچے جہاں ایک دوست رہا کرتے تھے موٹر چھوڑ کر گھر کی طرف بڑھے اور دروازہ کھٹکھٹانا چاہتے تھے کہ بازو سے گذرنے والے ایک صاحب نے تنبیہ کی "یہ گھر شریفوں کا ہے ادھر کا رُخ نہ کیجئے" یہ بیچارے سمجھے کہ ہم کسی اور غرض سے اس محلہ میں گھوم رہے ہیں

اور شائد غلطی سے معتبر اور شریف گھر پر بھٹک کر جا رہے ہیں۔
سُنا ہے کہ ایک بہت بڑے انڈسٹریلسٹ اس دارِ فانی سے گزر کر سیدھے جنت کے دروازے پر پہنچے اور داخلہ مانگا۔ فرشتوں نے پوچھ تاچھ کی، استفسار ہوا کہ انہیں جنت میں جگہ کیوں ملنی چاہئیے۔ انہوں نے بتایا دنیا میں بہت سارے خیراتی ٹرسٹ بنائے جن سے ہزارہا لوگوں کی فلاح و بہبود کے کام ہو رہے ہیں۔ اسپر فرشتوں نے اعتراض کیا "وہ سارے ٹرسٹ تو آپ نے اپنے نام کے لئے بنائے اور اُن کو اپنے ہی سے منسوب کر کے شہرت دوام حاصل کی ان سے خدا کی بڑائی یا بزرگی کا کوئی مقصد تو پُورا ہوا نہیں"۔
اسپر انہوں نے فرشتوں کی معلومات کی خاطر کہا "میں نے بہت ساری بڑی بڑی فیکٹریاں بنائی ہیں جن میں ہزارہا لوگوں کو کام ملتا ہے مزدوری ملتی ہے اور وہ مرفہ الحالی کی زندگی بسر کر رہے ہیں"
فرشتوں نے کہا "وہ تو آپ نے منافع کمانے اور اپنے لئے دولت سمیٹنے کی غرض سے کیا ہوا ہے اس سے خدا کا کون سا نام ہوا اور آپ جنت کے کیسے مستحق ہوئے؟"
اسپر انہیں بڑی حد تک مایوسی ہوئی لیکن ہمت نہ ہارتے ہوئے کہا "میں نے ایک موٹر بھی بنائی ہے اور وہ کچھ ایسی بنی ہے کہ ہر روز جب لوگ اسکو اسٹارٹ کرتے ہیں یا چلاتے ہیں تو لوگوں کو

بار بار "اے خدا۔ اے مالک!" کہنا پڑتا ہے۔ اسپر فرشتوں نے فوراً ہنس کر انہیں جنت کا داخلہ دے دیا!

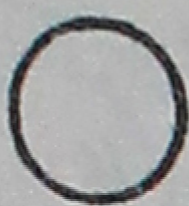
کلکتہ میں میں نے سُنا کہ وہاں کے دو چار ٹیکسی ڈرائیور مرنے کے بعد جنت کے دروازے پر پہنچے تو انہیں فوراً ہی داخلہ مل گیا اور جو پادری برہمن اور ملا انتظار میں تھے ان کو فیصلے کے انتظار میں ٹھہرے رہنا پڑا۔ انہوں نے بڑا سخت احتجاج کیا اور کہا کہ ہم برسہا برس سے خدا کا نام پھیلا رہے ہیں لوگوں کے دلوں میں خدا کی عظمت اور برتری کا سبق بٹھا رہے ہیں پھر بھی ان کے لئے جنت کے دروازے نہیں کھلتے؟

اسپر فرشتہ نے بتایا کہ سال بھر میں ان ٹیکسی ڈرائیوروں نے اپنی موٹر رانی سے خدا کی بزرگی عظمت اور قادرِ مطلق ہونے کا جو مظاہرہ کیا ہے وہ بیان سے باہر ہے ہر شخص ان کو دور سے ہی دیکھ کر خدا کو یاد کرنے لگتا ہے اور پھر خود اللہ تعالیٰ کے رحم و کرم سے ان کی جانیں بچ جاتی ہیں یہ بات کسی مذہبی پیشوا تک کے بس میں نہیں۔

عالیشان ڈپارٹمنٹ اسٹور کے سامنے ایک چھوٹی سی دکان جب کھولی گئی تو اسٹور کے مالک نے دھمکی دی کہ وہ اپنے حقیر حریف کو بہت جلد دیوالیہ بنا کر چھوڑے گا۔ چنانچہ چھوٹی دکان کی قیمتوں سے بہت زیادہ گھٹا کر یہ اپنا مال بیچنے لگا۔ ایک دِن دیکھا کہ چھوٹے دکاندار نے مکھن پنیر جام جیلی کی قیمتیں بہت کم کر کے بورڈ پر اعلان لگایا۔ اپنے

اپنی دکان پر انہیں اشیاء کی قیمتیں اس سے بھی ۱۵ فی صد گھٹا دیں۔ کچھ دنوں بعد دیکھا کہ بورڈ پر ۲۵ فی صد قیمتیں کم کردی گئی ہیں۔ اس نے ۳۰ فی صد کمی کا اعلان کیا اس پر مزید ۴۰ فی صد کمی کا نوٹس دیکھ کر اس نے ۵۰ فی صد کمی کردی اس رفتار سے اس نے سوچا کہ چھوٹا دوکاندار بہت جلد دکان چھوڑ کر بھاگ جائے گا لیکن ایسی کوئی صورت اسکو نظر نہ آئی بلکہ خود کو گھاٹے میں دیکھ کر بطور صلح جوئی پوچھا "تم اگر یہ راز بتادو کہ اسقدر گھٹے داموں پر بیچ کر بھی کس طرح دکان چلاتے ہو تو آج سے ہم لوگ آپس میں سمجھوتہ کرلیں ؟"

چھوٹے دکاندار نے بتایا "بڑی آسان بات ہے میں تو مکھن، پنیر جام جیلی بیچتا ہی نہیں صرف بھاؤ لکھ کر لگا دیا ہے!"



موت وحیات اپنے ساتھ بڑی الجھنیں لئے ہوئے ہیں لیکن ان المیہ موقعوں پر بھی تو لوگ ایسی بات کر گزرتے ہیں کہ جہاں قہقہے نہ سہی ہنسی کی گدگدی ضرور آجاتی ہے۔

بیوی کے مرنے پر ایک صاحب بہت زار و قطار رو رہے تھے ایسا لگتا تھا کہ یہ غم کے مارے اس سانحہ سے جانبر ہی نہ ہو سکیں گے۔ ان کے گہرے دوستوں نے پوچھا "بھئی تم دونوں میں ایسی کچھ بہت زیادہ محبت تو نہ تھی مگر تمہارا یہ غم کچھ حد سے زیادہ ہی دکھائی دیتا ہے" یہ بولے "اصل بات یہ ہے کچھ دنوں پہلے میری بوڑھی ماں کا انتقال ہوا تھا تو محلے کی ساری عورتیں مجھے یہ کہہ کہہ کر دلاسا دیتی تھیں کہ میں کچھ فکر نہ کروں وہ سب مجھے ماں کا پیار دیں گی۔ اور یہ نہ محسوس ہونے دیں گی کہ ماں گزر گئی ہے مگر اب جو بیوی چل بسی ہے تو کوئی بھی تو یہ نہیں کہہ رہی ہے کہ میں بیوی کا غم نہ کروں وہ مجھے اس کی کمی نہ محسوس ہونے دیں گی۔"

ایک اور صاحب کو دیکھا گیا کہ وہ ہر دوسرے تیسرے دن قبرستان میں ایک قبر کے سامنے سر جھکا کر زار و قطار رویا کرتے

لوگوں نے پوچھا "یہ آپ کے کسی قریبی عزیز کی قبر ہے کیا؟"
یہ بولے "جی نہیں یہ میری بیوی کے سابقہ شوہر ہیں مجھے اِن کے مرنے کا بیحد قلق ہے۔ وہ جو زندہ رہتے تو میں اس نیک بخت سے شادی ہی نہ کر سکتا۔"

ہمسایہ کی بیوی کا انتقال ہوا تو ہمارے دوست پُرسہ دینے اور دلاسے تشفی کے لئے ہو آئے۔ کسی اور پڑوسی کے گھر بھی یہی واقعہ ہوا تو پھر غم گساری کر آئے لیکن جب چند ماہ بعد ایک اور ہمسایہ کی بیوی کا انتقال ہوا تو یہ گئے نہیں گھر ہی پر بیٹھے رہے ان کی بیوی نے پوچھا "حقِ ہمسایہ تو یہی ہے کہ آپ ان کے پاس بھی جائیں۔"

شوہر نے بڑے دکھ سے اپنی بیوی کو کہا "محلہ بھر میں دلاسہ دینے کے لئے ایک میں ہی رہ گیا ہوں کیا میری قسمت میں ایسی گھڑی نہیں آئے گی کہ محلے والے میرے گھر آئیں اور اِس طرح سے مجھے بھی تسلی د تشفی دیں۔"

ایک عاشق زار نے جو فرقت کی آگ میں جل رہے تھے اپنی محبوبہ سے ملنے کے لئے بدقت تمام موقعہ نکالا اور اسکو بڑی لمبی تمہید اور ولولۂ عشق کے اظہار کے بعد کہا۔ "جانِ عزیز تمہاری خاطر میں دہکتی آگ میں کود سکتا ہوں، سمندر کی گہرائیوں میں غوطہ زن ہو سکتا ہوں۔ آسمانوں کی بلندیوں پر پرواز کر سکتا ہوں اور تن من دھن قربان کر سکتا

ہوں، جان دے سکتا ہوں' آج ملنے کا موقعہ نصیب ہوا ہے۔ میں شام
کے ۵ بجے تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا بشرطیکہ بارش نہ ہو۔"

شمالی چین میں جب کبھی نامرادانِ عشق بہ حسرت و یاس جلی لگی
اور رفت کے صدموں کی تاب نہ لا کر اس دارِ فانی سے کوچ کر جاتے ہیں یا
خودکشی کر بیٹھتے ہیں تو ان کی محبت کے احترام اور ان کی روحوں کو سکون و
تسلی کے لیے لاشوں کو ایکساتھ رکھ کر ان کی شادی کی رسومات کی تکمیل کر دی
جاتی ہے۔ اسی بناء پر تجویز ہوئی ہے کہ چہار دانگِ عالم میں شہرت یافتہ لیلی
مجنوں۔ شیریں فرہاد۔ سوہنی مہیوال۔ رومیو جولیٹ وغیرہ وغیرہ کی شادیاں
رچائی جائیں اور ایک ایسا ادارہ تشکیل دیا جائے کہ جب کبھی کسی خطۂ ارض
سے اس قسم کی اطلاع ملے تو فوراً ہی اس ادارہ کی طرف سے ان کی
شادی کی رسومات انجام دے دی جائیں اور تا قیامت ان کی روحوں کو آرام
پہنچانے کا بندوبست کر دیا جائے اور اگر وہ دوبارہ جنم لیں تو ان کے ایک
ساتھ میاں بیوی کی حیثیت سے وجود میں آنے کا بندوبست ہو جائیگا۔

کشاکش حیات، غمِ روزگار اور زندگی کی صعوبتوں سے
تنگ آ کر خودکشی کے عزم سے ایک صاحب ریل کی پٹڑیوں پر سر رکھ کر
لیٹ گئے۔ کسی نے دیکھا ساتھ میں توشہ دان بھی رکھا ہے تو پوچھ لیا کہ
آخر ماجرا کیا ہے۔ آتما ہتیا پر تلے ہوئے صاحب نے بتایا "آج کل ریل
گاڑیاں بڑی لیٹ چلنے لگی ہیں اور میں ان کی دیری کے باعث بھوکوں

نہیں مرنا چاہتا اسلیئے کھانا ساتھ میں رکھ لیا ہے"۔

کسی پڑوسی کا ہونہار لڑکا بیمار ہو کر مر گیا۔ سبھوں نے پرسہ دیا اور دلاسہ دینے کی خاطر کہا "غم نہ کریئے خدا آپ کو اس کا نعم البدل ضرور دے گا"۔ یہ بات دھیان میں رہ گئی اور کچھ دنوں بعد کسی کے والد بزرگوار کا انتقال ہوا تو اس موقعہ پر ہمارے بھائی نے وہی بات دہرائی "آپ اتنا غم نہ کریں خدا مرحوم کو جنت اور آپ کو ان کا نعم البدل عطا کرے گا"۔

مرے ہوئے عزیز اقربا کی روح کو ثواب پہنچانے کی خاطر حلوے، میٹھے اور کھانے پکا کر فاتحہ دلانے اور دوستوں کو کھلانے کی رسم عام ہے۔ اسی طرح مرقدوں پر پھول بھی چڑھائے جاتے ہیں لیکن چینی" بالعموم کھانے پینے کی چیزیں قبروں پر رکھ آتے ہیں۔ کسی نے طنزیہ پوچھا "آپ کے مرحوم دوست یہ کھانے کب کھائیں گے ؟" چینی نے برجستہ جواب دیا "جب آپ کے دوست اپنی ابدی نیند سے اٹھ کر پھولوں کی خوشبو سونگھنے آئیں گے نا۔ اسی وقت"۔

کہتے ہیں کہ راجہ کرشنا دیو رائے کی ضعیف والدہ نے بستر مرگ پر آموں کی فرمائش کی اور قبل اسکے کہ آم لائے جائیں قفس عنصری سے اس کی روح پرواز کر گئی۔ برہمنوں نے بڑا ہنگامہ مچایا کہ اس کی روح بے چین رہیگی اور تجویز کی کہ جملہ برہمنوں کو سونے کے

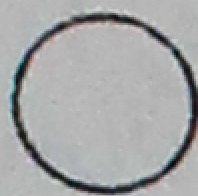
آم بنا کر تقسیم کیے جائیں۔ چنانچہ یہی ہوا اور برہمنوں نے مزے کیے۔ تنالی رام کرشنا گوان کی اس حرکت پر بڑا غصہ آیا اور یہ موقعہ کی تاک میں تھے کہ راجہ کے کسی اور رشتہ دار کا انتقال ہوا جنکو مرنے سے پہلے پیر کی تکلیف تھی اور تجویز تھی کہ اس زمانہ کے طریقہ علاج کے مطابق پیر پر گرم سلاخ کے داغ دیے جائیں لیکن یہ وقت پر نہ ہو سکا اسلیے موقعہ سے فائدہ اٹھا کر انہوں نے سب برہمنوں کو طلب کیا اور راجہ سے گزارش کی کہ اس سوگ واشی رشتہ دار کی تکلیف کو کم کرنے کیلئے جملہ برہمنوں کے پیروں پر جلتی ہوئی آہنی سلاخ کے داغ لگائے جائیں۔ سونے کے آموں کو ہضم کرنے کیلئے یہ مصیبت انہیں برداشت کرنی ہی پڑی۔

ایک نوجوان ڈینگیں مار رہے تھے کہ ان کے والد کا جب انتقال ہوا ہے تو بزرگوار لاکھوں کی دولت بنک میں، کئی کوٹھیاں اور فارم چھوڑ گئے ہیں۔ ان کی باتوں سے تنگ آکر ایک صاحب نے کہا "آپ جانتے ہیں جب میرے باپ مرے ہیں تو انہوں نے کیا کیا چھوڑا ؟!" لوگوں نے جاننا چاہا تو انہوں نے بتایا:

"مرحوم سارا جہان سارے بنکوں کی دولت اور پوری دنیا ہی چھوڑ گئے۔"

جوتشی نے ہاتھ کی ریکھائیں دیکھ کر بتایا کہ بڑی لمبی حیات ہے مگر ۴۰ سال کی عمر تک تنگ دستی اور تفکرات میں گزرے

گی، بہت پریشانیوں کا سامنا ہوگا۔ اُمیدوبیم سے پوچھا "اُسکے بعد؟"
کہا کہ اس کے بعد تنگدستی اور افلاس کی عادت ہو جائیگی۔



ہوٹل اور ریسٹورنٹ تو ہیں ہی ہنسی خوشی کھانے پینے اور دوستوں کی خاطر تواضع کرنے کی جگہیں۔

ایک فلمی ستارے جنکی مالی حالت کچھ گری گری تھی سستے قسم کے ریسٹورنٹ میں کھانے کیلئے گئے تو انہیں اپنا پرانا ساتھی جو کسی وقت درخشندہ ستارہ تھا وہاں پر نوکر کی حیثیت سے کام کرتا ہوا ملا۔ انہوں نے تعجب سے پوچھا "یار تم اس گھٹیا ریسٹورنٹ میں کام کرتے ہو؟" دوست نے فخریہ جواب دیا "ہاں کام کرتا ہوں مگر اس سڑے ہوٹل میں کھانا تو نہیں کھاتا۔"

میں نے امریکہ میں ایک چھوٹے سے ہوٹل میں ایک بہت بڑا بورڈ لگا دیکھا "یہاں پر ہزار آدمی کھانا کھا سکتے ہیں" ہوٹل کے کمرہ اور اسکی وسعت کے پیش نظر میں نے تعجب سے پوچھا "یہاں تو مشکل سو آدمیوں کی جگہ ہے پھر یہ آپ نے کیسے لکھ کر لگایا؟"

مالک نے مسکرا کر جواب دیا "آپ نے بجا فرمایا۔ اسی سائن بورڈ پر بغور نظر ڈالئے تو آپ کو اور بھی کچھ لکھا ہوا دکھائی دے گا۔ "یہاں پر ہزار آدمی کھانا کھا سکتے ہیں۔ وقتِ واحد میں نہیں۔"

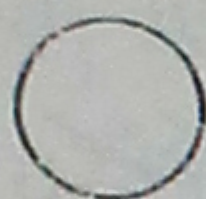
کسی ہوٹل والے پر یہ الزام تھا کہ وہ ہر چیز میں آمیزش کرتا ہے حتیٰ کہ مرغ کے گوشت میں بھی بھینس کا گوشت ملا دیا کرتا ہے۔

ثبوت اور گواہی سے جرم ثابت ہو گیا اور سزا دینے سے پہلے مجسٹریٹ صاحب نے دریافت کیا "یہ تو بتاؤ کہ کس حساب سے مرغ اور بھینس کے گوشت کو ملایا کرتے ہو؟"

ہوٹل والے نے کہا "حضور والا۔ ففٹی ففٹی (النصف النصف)"

مجسٹریٹ صاحب نے کہا "بھئی یہ بات تو سمجھ میں نہیں آئی آخر کس طرح آدھا آدھا کرتے ہو؟"

کہا "سرکار والا ایک مرغ تو ایک بھینس۔"



ہندوستان کی تقسیم کے بعد لاہور سے ایک بہت بڑے زمیندار دہلی آئے اور اپنے نئے مکان پر بڑا سا بورڈ لگایا

"لارڈ رندھیر سنگھ" لوگوں نے تعجب سے پوچھا: "یہ آپ لارڈ کیسے بن گئے؟ ہم نے تو صرف ایک ہی ہندستانی کو سنا تھا کہ انگریز سرکار کی طرف سے لارڈ کا خطاب ملا تھا اور وہ تھے لارڈ سری کرشن سنہا۔"

سردار جی نے بتایا "ہم لاہور میں بڑے لینڈلارڈ (زمیندار) تھے اور لوگ ہمیں لینڈ لارڈ ہی کہا کرتے تھے، لیکن تقسیم کے بعد ہماری لینڈ تو لاہور میں رہ گئی اور ہم خالی لارڈ رہ گئے۔"

پیکنگ کی گلیوں میں چلتے چلتے ایک امریکی سپاہی کو پیشاب کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ یہ ادھر بھاگا ادھر بھاگا کہیں اس کو بیت الخلاء ملا ہی نہیں۔ بے تاب ہو کر کسی چینی سے اپنی ضرورت کا اظہار کیا تو اس کو وہ اپنے ساتھ لے چلا، کچھ دور جانے کے بعد ایک عالیشان عمارت کے اندر یہ بے دھڑک لے گھسا اور

ایک بڑے ہال میں نہایت ہی خوبصورت قالین کو بتا کر کہنے لگا کہ آپ یہاں فارغ ہو سکتے ہیں۔ امریکی مزید انتظار کے قابل نہیں رہا تھا اسلئے پہلے تو اپنے مثانہ کو خالی کیا پھر پوچھا "یہ آپ چینیوں کی مہمان نوازی ہے؟"

چینی نے جواب دیا "جی نہیں یہ تو انگلستانی سفارت خانہ ہے"۔

دو ملکوں کی سرحد پر کڑی نگرانی اور دیگر تمام حد بندیوں کے باوجود روزانہ ایک شخص اپنی سائیکل پر گھانس کا بڑا سا گٹھا باندھ کر لے جایا کرتا۔ اس کی اور گھاس کے گٹھے کی اور سائیکل کی روز ہی تلاشی لی جاتی مگر ایسی کوئی چیز نہیں ملتی کہ جس پر اسمگلنگ کا شبہ ہو۔

یہ قصہ چلتا رہا ایک مدّت دراز تک اور پھر دونوں ملکوں میں ایسے تصفیے ہو گئے کہ یہ ناکہ بندی برخواست ہو گئی۔ تب اس شخص سے پوچھا گیا کہ وہ اب تو بتا دے کہ اتنے دِنوں تک آخر وہ سائیکل پر کس شے کی اسمگلنگ کیا کرتا تھا جو اس کی چوری پکڑی نہ جا سکی۔

اس نے مسکرا کر جواب دیا "میں سائیکلوں کی اسمگلنگ کیا کرتا تھا"۔

مُلازمت کے لئے امیدواروں کے انتخاب ہو رہے تھے۔ ایک امیدوار سے پوچھا گیا "آپ اور کیا کام جانتے ہیں؟"

"جی ہیں سرکس میں مسخرہ کا کام کرتا تھا"

"تب تو کوئی عمدہ سا مذاق کرکے بتائیے"

یہ سنتے ہی فوراً باہر انتظار میں بیٹھے ہوئے امیدواروں سے مخاطب ہوکر باآواز بلند کہا "اب آپ سب لوگ اپنے اپنے گھر واپس تشریف لے جاسکتے ہیں یہاں پر میرا انتخاب ہوچکا ہے"۔

ایک دیہاتی پہلی مرتبہ بمبئی آیا اور کسی اونچی بلڈنگ کے اندر داخل ہوکر ادھر ادھر دیکھ رہا تھا کہ ایک کمرہ پر نظر پڑی جس میں ایک بڈھی سفید بالوں والی خاتون داخل ہوئی اور اس کمرہ کا دروازہ بند کرلیا۔ کچھ دیر بعد اسی کمرہ کا دروازہ کھلا اور جو خاتون باہر نکلی وہ نوجوان سیاہ بالوں والی خوبصورت سی تھی۔ انہوں نے سوچا کہ یہ کوئی جادو کا کمرہ ہے جس میں بوڑھے داخل ہوتے ہیں تو جوان بن کر نکلتے ہیں بہت افسوس کیا کہ ان کی بوڑھی بیوی ساتھ نہیں ورنہ اس کو بھی جوان بناکر اپنے گاؤں واپس لے جاتے۔ اسی شوق کے مارے وطن لوٹے بیوی کو ساتھ لیا اور بمبئی کی اسی بلڈنگ میں پھر پہنچے اور اسی کمرہ کا دروازہ کھلا دیکھا اور بھی لوگ اندر داخل ہورہے تھے انہوں نے دروازہ بند ہونے سے پہلے بیوی کو اندر ڈھکیل دیا۔ کچھ دیر کے بعد وہی دروازہ پھر کھلا اور اس میں سے سچ مچ ایک نوجوان سی خوبصورت عورت باہر آئی۔ لپک کر انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا کہ اپنی بیوی

جوان ہوکر آئی ہے۔ اس عورت نے اس بدتمیزی پر زور کا طمانچہ رسید کیا اور انگریزی میں خوب سی گالیاں دیں یہ اور خوش ہوئے کہ بیوی نہ صرف جوان ہوکر آئی ہے بلکہ انگریزی بھی فرفر بول رہی ہے بعد میں جب لوگ انہیں بھگانے لے گئے تو معلوم ہوا کہ وہ کمرہ نہ تھا ایک لفٹ تھی۔

ایک امریکی کروڑپتی اپنے ذاتی ہوائی جہاز پر سفر کر رہے تھے۔ دوران پرواز پائلٹ ان کو بتاتا جاتا تھا کہ اب ہم فرانس پر سے اڑ رہے ہیں۔ پھر بتایا کہ اب سوئزرلینڈ پر ہیں۔ یہ کروڑپتی کچھ سننے کے موڈ میں نہ تھے۔ کہا۔ "تفصیلات میں پڑنے کی ضرورت نہیں صرف یہ بتاتے چلو کہ کس برّاعظم پر سے ہم پرواز کر رہے ہیں۔"

ریل گاڑی سرنگ میں سے گزر رہی تھی ایک منچلے نے اندھیرے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے خود اپنے ہاتھ کو زور سے پیار کر کے اپنی جگہ پر خاموش بیٹھا رہا۔ جب گاڑی سرنگ سے نکل پڑی تو ادھر ادھر بیٹھی ہوئی دو خواتین نے ایک دوسرے کو اس خیال سے مشتبہ نظروں سے دیکھا کہ اس کو پیار کیا ہے۔ ہر ایک سمجھتی رہی کہ دوسری کو اندھیرے میں پیار کیا گیا۔



میں نے ابتدا ہی میں یہ تشریح کی تھی لطیفہ وہ حکایت ہے کہ جسکا انجام رنجیدہ یا غمگین کبھی نہیں ہو سکتا۔ ان صفحات میں آپ کے لئے وہ سامانِ لذت فراہم کیا گیا ہے کہ جس سے آپ کا موڈ سدھر جائے اور نہ صرف اب بلکہ بعد میں بھی ان کی یادوں سے آپ کے چہرہ کا تناؤ دُور ہو جائے گدگدی محسوس ہو، ہونٹوں پر ہنسی کھیل جائے اور خدا کرے کہ وہ اتنی متعدی قسم کی ہو کہ ہر طرف قہقہے پھوٹ پڑیں شہنائیاں سی بج اٹھیں۔ زندہ دلی زندگی کا جزو لاینفک بن جائے اور ہر طرف سرور اور شادمانی پھیل جائے اور خود زندگی ایک لطیفہ بن جائے اور سارا جہان گل و گلزار۔

اسی خوشی آئند تمنّا کے ساتھ یہ ہدیۂ لطیف پیشِ خدمت ہے۔ اسکو اپنائیے اور اس کے ہر ایک لطیفہ کو بھرپور لطف لیجئے۔ مگر ذرا اسکا خیال رہے کہ مشہور ظریف گروشو مارکس نے کہا ہے "دوسرے کے مذاق پر ہنسنا بڑا مشکل کام ہے۔ بالخصوص اس وقت کہ جب کسی مذاق پر سب ہی لوگ ہنس رہے ہوں۔"

حاجی بشیر کی ایک دلچسپ روئداد ضرور یاد رکھئے کہ لطیفہ گوئی کی بھری محفل میں یہ لطیفہ پر لطیفہ سنائے جا رہے تھے اور سامعین کا رجحان ہنسنے پر نہ دیکھ کر انہوں نے اعلان کیا" دوستو! میں لطیفہ گوئی اس وقت تک جاری رکھوں گا کہ جب تک آپ سب ہنس کر میری باتوں کی داد نہ دیں"۔ تو عرض ہے کہ آپ بھی ایسی کسی محفل میں پھنس جائیں تو پہلے ہی لطیفہ پر قہقہہ مار کر ہنس دیں تاکہ جلد از جلد آپ کی گلو خلاصی ہو جائے اور جو خود آپ لطیفے سنا رہے ہوں تو بس لطیفوں کی بھرمار کر دیجئے حتیٰ اینکہ لوگ ہنس کر اپنی جان چھڑائیں۔

پروفیسر کنہیا لال کپور نے جو اپنے طنز مزاح اور لطافت بیان میں بڑا اونچا مقام رکھتے ہیں برسہا برس پہلے ایک مضمون لکھا تھا "سنانے کا مرض" اور یہ وضاحت کی تھی کہ یہ کوئی فرضی یا خیالی مرض نہیں بلکہ جس شدت سے پھیل رہا ہے اس کی بناء پر اسکو مرض کے بجائے وبا کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ اسکی علامات خفقان اور ہذیان سے ملتی جلتی ہیں اور اس کی علامات صرف ادیب افسانہ نویس اور شاعر میں پائی جاتی ہیں۔ شاید اس مضمون پر پروفیسر صاحب نظر ثانی کریں تو اسمیں لطیفہ گو کو ضرور شامل کرلیں گے بلکہ بدرجہ اول۔ یہ بھی سچ ہے کہ اس مرض کی تکلیف مریض کے خویش و اقارب کے بجائے دوستوں کو اٹھانی پڑتی ہے۔ مریض کو چاہے افاقہ ہو کہ نہ ہو وہ دوسروں کو ضرور مریض بنا

دینا ہے۔ بات کچھ اس قدر بڑھ گئی ہے کہ اگر مجھ میں اتنی جسارت اور ہمت نہ ہو کہ اپنے گھر آئے ہوئے مہمانوں پر اس کی مشق کروں تو میں کسی لطیفہ گو کو ضرور اپنی دعوت میں شریک کر لیتا ہوں اور اسکی وساطت سے اس عمل کو چالو کر دیتا ہوں۔ ایک میرے اچھے دوست کو جو لطیفہ گوئی میں ید طولیٰ رکھتے ہیں یہ مستقل اور بجا شکایت ہو گئی ہے کہ لوگ انہیں محض لطیفہ گوئی کے لئے اپنی دعوتوں میں بلاتے ہیں۔ یہ بات اور ہے کہ ان پر جب اس مرض کا حملہ ہوتا ہے تو یہ خود ہی بہت سارے لوگوں کو اپنی مہربانی سے مدعو کر لیتے ہیں۔

لطیفہ گوئی بھی تو ایک خاص فن ہے لیکن اس فن کا نہ تو کوئی قاعدہ ہے اور نہ کوئی قواعد۔ ہر شخص کی صلاحیت پر منحصر ہے کہ وہ کس طرح لطیفہ کو سامعین تک پہنچاتا ہے۔ اس خصوص میں کبھی اس کی ضرورت بھی نہ سمجھی گئی کہ اس کی کوئی شرح مرتّب کی جائے۔ لیکن لطیفہ کی سماعت کے آداب مقرر کرنے کی سخت ضرورت ہے اسکا کوڈ بنانا اتنا ہی ضروری ہے کہ جتنا آدابِ محفل کی پابندی۔

فرض کیجئے کہ آپ نے لطیفہ سنایا کہ بے حد کنجوس قسم کے چار دوست تھے ایک کا انتقال ہوا تو تینوں نے سوچا کہ اپنی دوستی کی آخری اور ابدی یادگار کے طور پر بطور نشانی قبر میں کچھ نہ کچھ رکھنا چاہئے ایک شخص نے اپنی انگوٹھی اتار کر رکھ دی دوسرے نے سونے کی اشرفی

رکھ دی تیسرے صاحب نے مرحوم کے نام کا چک لکھ کر رکھ دیا۔ ابھی سامعین اس کا لطف لے رہے ہیں اور ہنسی کا سلسلہ چالو ہوا ہی تھا کہ اور کوئی صاحب اِس میدان ظرافت میں کود پڑے اور کہا:

"نہیں یار یہ قصّہ تو الگ ہی ہے اور وہ یوں کہ ایک دوست نے سو روپے نقد رکھے دوسرے نے سو کا چک اور تیسرے نے تین سو کا چک مرحوم کے نام لکھ کر نقد روپے اور دُوسرا چک خود اٹھا لیا۔"

اب بتائیے کہ کون سا آسمان ٹوٹ پڑا تھا کہ وہ لطیفہ اسی حد تک رہ جاتا اور لوگ ہنسنے ہنسانے کے مُوڈ میں مگن رہتے۔

لطیفہ گوئی کے لئے حاضرینِ محفل کے مُوڈ اور وقتیہ سماں پر دھیان دینا ضروری ہوتا ہے۔ میرے دوست عبدالوحید خاں (ناظم آثارِ قدیمہ آندھرا پردیش) کو کالج کے زمانے سے اسکا ملکہ تو تھا لیکن ان کا ہنر اسی وقت اُجاگر ہوا کہ جب وہ اجنتہ کے کیوریٹر کے فرائض انجام دیا کرتے تھے۔ اپنے فن کی انتہائی ہنرمندی کو بھی یہ دیکھ سمجھ کر عمل میں لاتے۔ دیکھا کہ کوئی تاریخی معلومات کا جویا ہے تو تاریخ کا سبق پڑھا دیتے، کسی میں مصوّری سے دلچسپی پائی تو اس کو تصاویر اور رنگ آمیزی وغیرہ پر لیکچر دے دیا اور جو کسی کو اِن سب چیزوں سے معرا اور کورا پایا تو اسکو ادھر ادھر کی باتوں میں لگا دیتے۔ ایسے ماہر کو بھی ایک بار ہم نے عاجز دیکھا تو اس طرح کہ کسی والئی ریاست کو یہ اجنتہ کی تصویریں

اور دیکھا کہ راجہ صاحب ایک تصویر نہایت انہماک سے دکھا رہے تھے کے سامنے ساکت و صامت کھڑے ہو گئے۔ یہ اسی انتظار میں کہ یہ راز کھلے کہ ان کا شوق کدھر جا رہا ہے۔ یکایک راجہ صاحب کھِل کھِلا کر ہنس پڑے اور ایک پھلے ہوئے پیٹ والے پستہ قد انسان کی مورت کی طرف بتا کر چیخ اٹھے " بالکل دادا ابا کی صورت۔ ہو بہو ان ہی کی شکل" اور پھر مصاحبوں سے داد طلب کرنے لگے۔ یہ بے چارے نہ صرف اپنی کیوریٹری بھول بیٹھے بلکہ چوکڑی بھی بھول گئے۔ اس طرح پر اگر آپ کو لطیفہ گوئی کے دوران کسی ناقدر شناس سے سابقہ پڑے تو سکوت کو اپنائیے اور اس کتاب کے کسی بھی لطیفہ کو ضائع نہ کیجئے۔ آپ کی اور ہماری عزت قائم و برقرار رکھنے کا بس یہی راز ہے۔

اب وقت آگیا ہے کہ پرانی کہاوت " خوردن برائے زیست نہ کہ زیستن برائے خوردن" کو بدل کر کچھ اس طرح کر دیا جائے " ہنسنا جینے کے لئے اور جینا ہنسنے کے لئے"

ع خوش باش کہ دم زندگانی این است
